اقبال
امامِ ادب
کتب خانہ
تاج آفس
بندر روڈ
کراچی

اقبال

از

رئیس احمد جعفری

ناشر

شیخ نذیر احمد مالک کتب خانہ تاج آفس

محمد علی روڈ، بمبئی نمبر ۳

صرف ادبی نقطۂ نظر سے اقبال کی شاعری

اور

شاعری کے آب و رنگ پر سیر حاصل اور مکمل تبصرہ

نخستیں لالۂ صبح بہارم
پیاپے سوزم از داغے کہ دارم
بچشم کم مبیں تنہائیم را
کہ من صد کاروان گل در کنارم

فہرست

صفحات

اقبال
حالات و سوانح :- سفر یورپ - وکالت کی اجازت - شادی ، شاعری
سیاسیات میں حصّہ - آمدنی - زندگی کا آخری دور
علالت - وفات - تجہیز و تکفین - ۔۔۔ ۷ تا ۱۹

اقبال
تاثرات و مشاہدات :- ۔۔۔ ۲۰ تا ۳۱

اقبال کی شاعری
سر شوے ، نالہ ، آہ و فغاں :- ۔۔۔ ۳۲ تا ۳۹

اقبال کا احتساب
صرف ادبی نقطۂ نظر سے :- حقائق و معارف ، فلسفہ ، درس ، پیام ، خطاب
ٹھوکر ، فکر مسلسل ، اسرار و رموز ، فلسفۂ ہست و بود -
سوال و استفسار ، حسن و محبت ، سوز و الم ، جدت تشبیہ
طنز و تعریض - حسن تکلم - زبان و بیان - تغزل ۔۔۔ ۴۰ تا ۹۶

عرضِ ناشر

یہ مختصر سی کتاب تاج اُردو سیریز کی یادگار ہے، تاج اُردو سیریز کا سلسلہ اس لئے بند کر دیا گیا کہ مختلف بڑی چھوٹی کتابیں ضخامت اور قیمت کی پابندیوں سے آزاد رہ کر شائع کی جائیں جو نہایت عمدگی سے پروگرام کے تحت شائع ہو رہی ہیں، جلد ہی وہ وقت آ رہا ہے کہ اُردو کے بہی خواہ ہماری خدمات پر خوش ہونگے اور بمبئی جیسے شہر میں اُردو کے اس عظیم الشان اور بے نظیر اردو اشاعت گھر پر فخر کر سکیں گے۔

یہ کتاب تاج اُردو سیریز کی اس لئے یادگار ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن تاج اُردو سیریز میں شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے - اب یہ دوسرا ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے ؛

(شیخ) نذیر احمد
مالک تاج آفس بمبئی

یہ کتابچہ

اقبال کی شاعری پر، مختلف پہلوؤں پر بحث و گفتگو کا سلسلہ عرصہ سے جاری ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ خالص ادبی نقطۂ نظر سے اقبال کی شاعری پر اب تک گفتگو نہیں کی گئی۔

اس گرانی کے زمانہ میں کوئی ضخیم کتاب نہیں پیش کی جا سکتی، سر دست اس "کتابچہ" پر اکتفا کیا جاتا ہے، پھر اگر موقع ہوا، حالات نے اجازت دی، اور ناشر صاحب آمادہ ہوئے تو اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھنے کا ارادہ ہے۔

اس کتابچہ میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے، اس کی حیثیت "مشتے نمونہ از خروارے" سے زیادہ نہیں۔

رئیس احمد جعفری

اقبال

حالات و سوانح

اقبال کشمیر کے ایک برہمن خاندان کے چشم و چراغ تھے، جو گذشتہ کئی نسلوں سے سیالکوٹ میں مقیم تھا۔ اس خاندان نے اسلام قبول کر لیا تھا، اور اس اعتبار سے اقبال "نو مسلم" تھے، انہیں خود بھی اپنے نو مسلم اور ترجمان اسلام ہونے پر ناز تھا، وہ خود کہتے ہیں۔

برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز ے!

اقبال کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ بڑے اللہ والے آدمی تھے، محدود پیمانہ پر تجارت کر کے گذر بسر کرتے تھے۔

اقبال کے بڑے بھائی کا نام شیخ عطا محمد تھا، موصوف اب تک بقید حیات ہیں، ۱۸۷۳ء میں اقبال کتم عدم سے عالم وجود میں آئے، یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمان انگریزی تعلیم کی طرف راغب نہیں ہوتے تھے، ۱۸۵۷ء کا غدر ابھی کل کی بات تھی۔ کل تک وہ اس دیس کے حکمران تھے، آج ان کی حکومت قصۂ ماضی بن چکی تھی، اور وہ اب کسمپرسی اور بیچارگی کی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن اقبال کے والد نے حالاتِ زمانہ کا اچھی طرح احساس کر لیا تھا، انہوں نے اپنے ہونہار لڑکے کو انگریزی اسکول میں بٹھا دیا۔

اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب انگریزی تعلیم حاصل کر کے انجنیئر بنے

اور اقبال مشن اسکول میں اپنی تعلیم کا ایک دور ختم کر کے کالج میں داخل ہو گئے۔

کالج میں انہیں مولوی میر حسن سا شفیق استاد ملا۔ موصوف فارسی اور عربی کے ماہر تھے، اور ان کی تعلیم کا خاص گر یہ تھا کہ وہ اپنے شاگردوں میں عربی فارسی کا صحیح ذوق پیدا کر دیتے تھے۔ لائق استاد اور ہونہار شاگرد کے تعاون کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال کی نظر فارسی اور عربی پر بہت وسیع ہو گئی۔ فارسی میں تو انہوں نے اتنی مہارت پیدا کر لی، کہ اسی زبان کو انہوں نے اپنی شاعری کا ذریعہ بنا لیا۔ اقبال اپنے استاد مولوی میر حسن کا بہت احترام کرتے تھے اور ان سے بیحد محبت کرتے تھے۔ چنانچہ جب انہیں ان کی علمی قابلیت کی بنا پر "سر" کا خطاب ملا، تو انہوں نے اس وقت تک یہ خطاب لینا منظور نہ کیا جب تک ان کے استاد مولوی میر حسن کو "شمس العلما" کا خطاب نہ ملجائے اور بالآخر ان کا یہ مطالبہ پورا ہوا۔

ایف۔ اے کا امتحان پاس کر کے اقبال لاہور چلے آئے، اور مزید تعلیم کی تکمیل انہوں نے لاہور ہی میں کی،

گورنمنٹ کالج لاہور میں جہاں اقبال داخل ہوئے تھے، پروفیسر آرنلڈ کا سا شفیق استاد انہیں ملا۔ آرنلڈ کے فیضِ صحبت سے اقبال کے ذہن و دماغ میں جلا پیدا ہو گئی، یہاں انہوں نے ایم۔ اے تک تعلیم حاصل کی، پھر اورینٹل کالج میں فلسفہ کے پروفیسر ہو گئے۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد وہ گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہو کر چلے آئے۔

سفرِ یورپ

۱۹۰۵ء میں اقبال نے یورپ کا سفر اختیار کیا، اور لندن پہنچے، پھر وہ

کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہو گئے، اور فلسفہ کی مزید تکمیل کرنے لگے، یہاں تعلیم کی تکمیل کر کے وہ یورپ کے علم کدوں کے طواف پر نکل گئے، پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی، پھر لنڈن آئے، اور بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ پروفیسر آرنلڈ ہندوستان سے ایران واپس آچکے تھے، اور اب وہ کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ وہ چھ مہینہ کی چھٹی پر گئے تو اقبال ان کی جگہ پروفیسر مقرر ہو گئے۔ اور کیمبرج کے طلبہ کو عربی پڑھاتے رہے۔

وکالت کی اجازت

یورپ سے واپس آکر اقبال پھر گورنمنٹ کالج میں پڑھانے لگے، اب انہیں پانچسو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی، اور عدالت میں بیرسٹر کی حیثیت سے پریکٹس کی بھی اجازت تھی۔

دو اڑھائی سال انہوں نے کالج کی ملازمت جاری رکھی، پھر یکایک استعفا دے دیا۔ پرنسپل نے لاکھ سمجھایا لیکن وہ اپنے ارادہ پر قائم رہے، وہ ملازمت کی گرانباریوں کو پسند نہیں کرتے تھے، امن و اطمینان اور آزادی و بے پروائی کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ اب انہوں نے وکالت کی طرف نسبتاً زیادہ توجہ کی۔ لیکن اب بھی وہ اتنے ہی مقدمے لیتے تھے۔ جن سے ان کے مصارف چل جائیں۔ انہیں روپیہ کمانے کی ہوس نہیں تھی۔

شادی

اقبال نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے مسٹر آفتاب اقبال، بیرسٹر ان کے

صاحبزادے موجود ہیں۔

دُوسری بیوی سے "جاوید اقبال" ہیں اور ایک صاحبزادی منیرہ بانو، اقبال جاوید کو بہت چاہتے تھے۔ دُوسری بیوی سے بھی انہیں بہت تعلق خاطر تھا، لیکن اقبال کی وفات سے کچھ عرصہ پیشتر وہ بھی اس دُنیا سے رُخصت ہو گئیں۔ یہ صدمہ اقبال کے لئے ناقابلِ برداشت ثابت ہوا۔

اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا اقبال بہت خیال رکھتے تھے۔ جاوید اور منیرہ کی تربیت کے لئے اُنہوں نے ایک یورپین معلّمہ کا بندوبست کیا تھا۔

شاعری

اقبال کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا، وہ ابھی سیالکوٹ کے مشن اسکول میں ایک نو عمر طالب علم تھے کہ اُنہوں نے شعر کہنا شروع کر دیئے تھے۔ طبیعت بلا کی موزوں پائی تھی۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعری بھی ترقی کرتی رہی، اور اس میں پختگی آتی رہی شروع شروع میں اُن کی شاعری پر وطن پرستانہ رنگ غالب تھا، لیکن بعد میں اُن کی شاعری یکسر "پیامِ اسلام" بن کر رہ گئی تھی، وہ دُنیا کے تمام دُکھ درد کا علاج یہ سمجھتے تھے کہ وہ اسلام کے اصولوں پر اور اس کے بنائے ہوتے نظام پر عمل کرے۔

ایک مشاعرہ میں مرزا ارشد گورگانی بھی موجود تھے، اقبال ابھی نو عمر تھے، لیکن انہوں نے بھی مشاعرہ میں اپنی غزل پڑھی، جب اُنہوں نے یہ شعر سنایا ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے　　قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو سارا مشاعرہ پھڑک گیا، اور مرزا ارشد نے بھی جی کھول کر داد دی۔

اقبال شاعری میں نواب مرزا خاں داغ کے شاگرد تھے۔ داغ نے پہچان لیا تھا یہ جوہر قابل ہے۔ ایک روز آفتاب بن کر چمکے گا۔ انہوں نے اقبال پر کافی توجہ کی یہ وہ زمانہ تھا کہ داغ اُستاد حضور نظام کی حیثیت سے حیدرآباد میں مقیم تھے، اصلاح کا سلسلہ خط و کتابت کے ذریعہ جاری تھا، کچھ عرصہ بعد داغ نے اصلاح کا سلسلہ بند کر دیا۔ انہوں نے فرمایا اب اقبال اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ انہیں اصلاح کی ضرورت نہیں رہی۔

ستمبر ۱۹۲۴ء میں اقبال کے اُردو کلام کا ایک مجموعہ "بانگِ درا" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اقبال اُردو چھوڑ کر فارسی کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ اور اپنا پیام دُنیا کے نام فارسی زبان کے ذریعہ دے رہے تھے۔

اقبال کی کتاب حسبِ ذیل ہیں:

پیامِ مشرق

اسرارِ خودی

رموزِ بےخودی

زبورِ عجم

جاوید نامہ

بالِ جبریل

ضربِ کلیم

ارمغانِ حجاز

"زبورِ عجم" پر خود اقبال کو بھی بہت ناز تھا، کہتے ہیں۔

سہ اگر ہو ذوق تو فرصت میں پڑھ زبورِ عجم
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

ان میں سے اُن کی ہر کتاب ایک مستقل پیام اور دعوت کی حامل ہے۔

سیاسیات میں حصّہ

۱۹۲۵ء میں اقبالؔ اپنے دوستوں کے اصرار سے مجبور ہو کر پنجاب کونسل کی ممبری کے لئے کھڑے ہوئے اور بہت نمایاں اکثریت سے کامیاب ہوئے، اس کے بعد سے اُنہوں نے برطانوی ہند کی سیاست میں مستقل طور پر حصّہ لینا شروع کر دیا۔

لندن میں جو گول میز کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اس کے آخری اجلاس میں بھی وہ مندوب کی حیثیت سے شریک ہوتے۔

اسلامی ہند کی سیاسیات میں بھی وہ سرگرم حصّہ لیتے تھے۔

۱۹۱۰ء میں ہز ہائنیس آغا خاں کی صدارت میں جو مسلم کانفرنس قائم ہوئی تھی۔ اس میں بھی اُنہوں نے نمایاں حصّہ لیا، اور بعد میں اس کانفرنس کے صدر بھی ہوئے۔

مسلم لیگ سے بھی انہیں گہرا تعلق تھا، اور اس کی تحریکوں میں بھی وہ ہمیشہ حصّہ لیتے رہتے تھے، ۱۹۳۰ء کے اجلاس الہ آباد کی اُنہوں نے صدارت کی تھی۔ اور اپنے خطبۂ صدارت میں پہلی بار اُنہی نے پاکستان کا اشارہ کر کے مسلمانانِ ہند کے سامنے ایک واضح نصب العین رکھا تھا۔ اس وقت اس نظریہ کی سخت مخالفت ہوئی تھی، لیکن بعد میں یہ مسلک مسلم لیگ نے سرکاری طور پر اختیار کر لیا۔ اور آج مسلمانانِ ہند کا وہ مقصدِ زندگی بنا ہوا ہے۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اقبالؔ کو مسلمانوں کے علاوہ دوسرے فرقوں اور قوموں سے پرخاش تھی، وہ ہر قوم اور ہر فرقہ کی محبت اپنے دل میں رکھتے تھے، "ہمالیہ" پر انہوں نے جو شاندار نظم کہی ہے۔ اسے کون بھول سکتا ہے، یا ہندوستان کا جو قومی ترانہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

کہا ہے۔ اسے کون محبِ وطن نظر انداز کر سکتا ہے، یا "نیا شوالہ" کے عنوان سے انہوں نے جو نظم کہی ہے، اسے کون ہے جو درد و سوز کے ساتھ نہ پڑھے، اسی طرح سوامی رام تیرتھ، گرو نانک، رام چندر جی وغیرہ پر انہوں نے جو نظمیں کہی ہیں، ان کے اثر، کیف، واقعیت سچائی سے کون انکار کر سکتا ہے؟

اقبالؔ کا دل وہ دل تھا، جو انسانی محبت اور عظمت سے معمور تھا، اور یہی جذبہ تھا جس نے اسے شاعرِ مشرق بنا دیا۔ وہ کسی ایک قوم کا بھلا نہیں چاہتا ہے۔ بلکہ ساری دنیا کا بھلا چاہتا ہے۔ سب کو امن چین اور سکھ کی زندگی بسر کرنے کے طریقے بتاتا ہے۔

آمدنی

شاعروں میں قصیدے کہتے کہتے، خودداری کا مادہ گھٹتے گھٹتے ایک جوئے کم آب رہ جاتا ہے، لیکن اقبالؔ کے ہاں وہ بحرِ بے کراں کی صورت میں نظر آتا ہے۔

اقبالؔ نے اگر خودداری کا راستہ نہ اختیار کیا ہوتا تو یقیناً اس کی آمدنی ہزاروں سے متجاوز ہوتی، وہ ہائی کورٹ کا جج بن سکتا تھا۔ کونسل کا صدر بن سکتا تھا۔ کسی دربار کا مقرری شاعر بن سکتا تھا۔ قصائد کہہ کہہ کر اپنے گراں قدر وظائف مقرر کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے

ان راستوں میں سے کوئی راستہ اختیار نہیں کیا، وہ فقر و قناعت کی زندگی کو امارت اور ثروت کی زندگی پر ترجیح دیتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ اس کی زندگی ہمیشہ مالی مصائب کی شکار رہی۔ لیکن اس نے اس کی ذرا بھی پروانہ کی۔

وفات سے کچھ پیشتر "یوم اقبالؒ" کے موقع پر ہندوستان کی ایک بہت بڑی ریاست کے وزیر اعظم نے ایک ہزار روپیہ کا چیک بطور تواضع ارسال فرمایا تھا۔ لیکن اس مرد قلندر نے پوری شانِ استغنا کے ساتھ،

؎ غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اُس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

کہہ کر بصد شکریہ اُسے واپس کر دیا،

جب تک اُن کی صحت اجازت دیتی رہی، وہ پریکٹس کر کے اپنے مصارف پورے کرتے رہے۔ لیکن زندگی کے آخری دور میں اُنہوں نے وکالت یکسر ترک کر دی تھی۔ اور آمدنی بہت محدود ہو گئی تھی۔ کتابوں کی فروخت سے جو آمدنی ہوتی تھی اس پر وہ قناعت کرتے تھے۔

سر راس مسعود مرحوم اقبال کی بہت عظمت کرتے تھے اور اُن سے بے حد محبت کرتے تھے، جب وہ بھوپال میں وزیر تعلیم ہو کر گئے تو اُنہوں نے اقبال کو بڑی محبت سے کئی بار بھوپال بلایا اور وہاں اُن کا علاج کرایا۔

اُنہی کی سعی و کوشش سے، نواب صاحب بھوپال نے پانچ سو روپیہ ماہوار تاحیات کا وظیفہ اقبال کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ یہ رقم اقبال کے لئے کافی تھی۔

وہ اسپر قناعت کر کے اپنے علمی و ادبی کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔

زندگی کا آخری دَور

اب وہ تمام تر عزلت کی زندگی بسر کر رہے تھے، جلسوں، جلوسوں، نعرہ بازوں سے اُنہیں کوئی سروکار نہ رہ گیا تھا۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ اقبال مشاعروں میں شریک ہوتے تھے، جلسوں کی صدارت کرتے تھے، انجمن حمایت اسلام لاہور کے عظیم الشان جلسوں میں اُنہوں نے "نالۂ یتیم" وغیرہ عنوانوں پر جو درد انگیز نظمیں پڑھی تھیں اُن کی یاد اب تک لوگوں کے دِلوں میں تازہ ہے، لیکن اب وہ یہ سب کچھ چھوڑ چکے تھے، علائق دُنیوی سے اب اُنہیں کوئی تعلق نہ رہ گیا تھا، وہ تھے اَور اُن کا گوشۂ عافیت!

اب وہ اپنا تمام وقت مخصوص علمی کاموں پر صرف کرنا چاہتے تھے۔ اور فرصت کا جو وقت مِلتا تھا وہ اِن کاموں پر صرف بھی کرتے تھے۔

علالت

لیکن اَب ان کی صحت گرنے لگی تھی، یُوں تو ہمیشہ سے اُنہیں کچھ نہ کچھ شکایات رہیں، پندرہ بیس برس پہلے اُنہیں درد گُردہ کی شکایت ہو گئی تھی۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں کا علاج کیا مگر صحت نہ ہوئی، آخر تنگ آ کر یورپ جانے کا قصد کیا، لیکن خوش قسمتی سے ڈاکٹر انصاری مرحوم کے بڑے بھائی حکیم نابینا صاحب اُنہیں مِل گئے۔ اَور اُن کے علاج سے اُنہیں ایسی شفا ہوئی کہ یہ مرض تقریباً جاتا رہا۔

اب پھر متعدد امراض نے ان پر حملہ کیا، اور اُنہوں نے ڈاکٹروں کے بجائے پھر حکیم نابینا کی طرف رجوع کیا، فائدہ اب بھی ہو رہا تھا لیکن رفتار سُست تھی۔

۳۵ء میں لیڈی اقبال کا انتقال ہو گیا، اس حادثہ نے اُنہیں بیمار بنا دیا، اب وہ بھی اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے، ایک روز بیٹھے بیٹھے اُنہوں نے وصیت نامہ بھی تیار کر دیا۔ اور اسے رجسٹرار کے پاس بھیج دیا۔

وفات سے سال بھر پیشتر ان کی آنکھوں میں موتیا اُتر آیا تھا، سانس بھی پھولنے لگا تھا، حالت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ وہ اُٹھ کر غسل خانہ تک بھی نہیں جا سکتے تھے۔

دسمبر ۳۷ء میں حالت اور زیادہ بگڑنے لگی، طبی اور ڈاکٹری علاج جاری تھا شفاء الملک حکیم محمد حسن صاحب قرشی اب اُن کی دیکھ بھال کرتے تھے، شفاء الملک سے اقبال کو بڑی عقیدت تھی۔ وہ ان کی ذہانت اور قابلیت کے قائل تھے، اب وہ انہی کی مجوزہ دوائیں استعمال کرتے تھے۔

اب ان کا دل بھی بہت کمزور ہو گیا تھا کبھی کبھی دونوں کندھوں کے بیچ میں درد بھی ہونے لگتا تھا۔ یہ بڑی خطرناک علامت تھی، لیکن اس حالت میں بھی فکر سخن کا سلسلہ جاری تھا، بحث و گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

جواہر لال نہرو ملاقات کے لئے آئے۔ اُن سے دیر تک تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ پنڈت جی اس ملاقات سے بہت متاثر ہوتے تھے۔

وفات

حالت نازک ہوتی گئی، ایک روز اُن کی نازک حالت دیکھ کر اُن کے بڑے بھائی

شیخ عطا محمد رونے لگے۔ اقبال نے انہیں تسکین دی۔ اور کہا۔ آپ روتے کیوں ہیں؟ پھر یہ شعر پڑھا۔

؎ نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم برلبِ اوست

اب یہ حالت ہو گئی تھی کہ پلنگ پر بیٹھے ہیں، مجلس جمی ہوئی ہے، باتیں کر رہے ہیں کہ سانس اُلٹ گیا اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ ذرا دیر بعد طبیعت سنبھلی اور پھر باتیں شروع کر دیں۔

رسالتمآب سے اقبال کو غیر معمولی محبت اور شیفتگی تھی، اب تو حال یہ تھا کہ حضور کا نام لیا یا کسی سے سُنا، اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

قرآن شریف بڑی خوش الحانی اور ترنم سے پڑھنے کے عادی تھے، اب ان کا گلا بیٹھ گیا تھا، اور وہ قرآن الحان اور ترنم سے نہیں پڑھ سکتے تھے، اپنی اس بے بسی پر وہ بہت ملول ہوتے تھے۔

اُن کا ایک دیرینہ اور وفادار ملازم علی بخش تھا، ایک روز اُن کی حالت دیکھ کر وہ رونے لگا۔ لوگوں نے اسے روکا، اقبال نے کہا، اسے جی بھر کے رو لینے دو طبیعت ہلکی ہو جائے گی۔ پرانا ملازم ہے، اپنے بارِ خاطر کو دبا نہیں سکتا۔

اقبال کو موت کا ذرا بھی دھڑکا نہیں تھا، وہ بڑی خوشی سے پیامِ موت پر لبیک کہنے کو تیار تھے۔

وفات سے تین چار روز پیشتر بلغم میں خون آنے لگا تھا۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا، دل کی طرف جانے والی رگ کے پھٹ جانے کا اندیشہ ہے، ۲۰ اپریل کی شام

کو ڈاکٹروں نے کہا اب صرف چند گھنٹوں کے مہمان ہیں ۔ اس رات کو تین بجے تک سوتے رہے، پھر اُٹھے تو طبیعت بے کل تھی، صبح کے سوا پانچ بجے پاؤں پھیلا دیئے ۔ آنکھیں اُوپر کی طرف اُٹھائیں ۔ دِل پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے "اللہ! یہاں درد ہے!" ان کا خادم علی بخش ان کے پاس تھا، اس نے اپنا بایاں ہاتھ ان کے دِل پر رکھا، اور داہنے ہاتھ سے سر کو تھام لیا، اتنے میں اُنہوں نے آنکھیں بند کرلیں ۔ مُنہ خود بخود قبلہ کی طرف پھر گیا، اور مشرق کا وہ سب سے بڑا شاعر ہمیشگی کی نیند سو گیا ۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبال اس عالم خاکی سے عالم باقی میں پہنچ گیا، جہاں نہ کوئی درد ہے نہ تکلیف، نہ دُکھ ہے نہ مصیبت نہ اندیشہ نہ دھڑکا، انا للہ و انا الیہ راجعون ۔

تجہیز و تکفین

وفات کی خبر آناً فاناً سارے شہر میں پھیل گئی ۔ بازار بند ہوگئے اور لوگ جاوید منزل کی طرف آنے لگے ۔ شام کو جنازہ اُٹھا اور بادشاہی مسجد کے میناروں کے نیچے اقبال کو سپرد گور کر دیا گیا ۔

اقبال کی وفات پر سارا ہندوستان تڑپ اُٹھا ۔ سرکاری اور غیر سرکاری، کانگرسی اور مسلم لیگی، ہر حلقہ میں اُن کا ماتم کیا گیا ۔

ہندوستان کے باہر بھی اقبال کا سوگ منایا گیا، عالم اسلام میں بھی تعزیتی جلسے ہوئے، یورپ کے کئی شہروں میں بھی تعزیتی تجویزیں منظور ہوئیں ۔

سر سکندر حیات خاں مرحوم مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لئے کلکتہ گئے ہوئے تھے ۔ گورنر پنجاب سے شاہی مسجد میں تدفین کی اجازت لی گئی ۔ جو انہوں نے ازراہِ عنایت

خون آدے دی اور اقبال وہیں ہمیشہ کے لئے چین کی نیند سو گئے ۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا!
مسلمانوں میں جو بڑے لوگ اپنی جگہ خالی کرتے ہیں ان کا کوئی جانشیں نہیں
ملتا ۔ اقبال نے اپنی جگہ خالی کر دی، اور آج اسلامی ہند میں کوئی نہیں ہے جو اس خالی
جگہ کو پُر کر سکے ؎

اقبال

تاثرات و مشاہدات

از:- رئیس احمد جعفری

میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ایک طالب علم تھا، جامعہ کے اساتذہ میں نذیر نیازی صاحب، کو اقبال سے خصوصیت تھی - اُنہوں نے ایک "حلقۂ اقبال" قائم کر رکھا تھا، اس حلقہ میں، اس مردِ حق آگاہ کے کلام و بیان کی تشریح و تفسیر ہوتی تھی - اس کے خیالات و حسیات کو اجاگر کیا جاتا تھا - اس کی فکر آسمان پیما، اور اس کے پیغام حیات آفرین پر بحثیں ہوتی تھیں، اس کے مشکل اور دقیق اشعار کی "مشکل کشائی" ہوتی تھی، اس کے اندازِ بیان اور اسلوبِ کلام پر نقد و تبصرہ ہوتا تھا، ہم لوگ سامع کی حیثیت سے بیٹھے تھے، اور نیازی صاحب بُلبلِ ہزار داستان کی طرح اپنی خوش بیانی اور معنی آفرینی سے ایک سماں پیدا کر دیتے تھے، میں اس حلقہ میں باقاعدہ شریک نہیں ہوتا تھا - کبھی کبھی چلا جاتا تھا، لیکن اقبال کی جو عظمت میرے دل میں بیٹھی ہوئی تھی، وہ اس کبھی کبھی کے شریکِ حلقہ ہونے سے اور بڑھ گئی تھی، واقعہ یہ ہے کہ نیازی صاحب کا اقبالیات پر نہایت وسیع اور گہرا مطالعہ تھا اور چونکہ اکثر و بیشتر اُنہیں خود بھی اقبال سے براہِ راست مستفید ہونے کے مواقع ملتے رہتے تھے، اس لئے اس مسئلہ پر، وہ امام کی حیثیت رکھتے تھے -

۱۹۳۳ء میں اقبال کسی کام سے دہلی آئے - اربابِ جامعہ نے طے کیا کہ انہیں

ایک پارٹی دی جائے، اور ان سے تبادلہ خیالات کیا جائے۔ اس موقع پر تعلیمی مرکز نمبر ۱ کا ہال سجایا گیا۔ اسی کے اندرونی صحن میں پارٹی کے انتظامات ہوئے، ساتھ ہی ساتھ مکتبہ جامعہ کے مطبوعات کی نمائش بھی کی گئی۔

سہ پہر کو علامہ تشریف لائے، سب سے پہلے اساتذہ اور سربرآوردہ حاضرین کا موصوف سے تعارف کرایا گیا، میں انجمن اتحاد (یونین) کا نائب صدر تھا، میرا تعارف بھی کرایا گیا۔ حضرت علامہ مطبوعات جامعہ کی نمائش کا نظارہ کرتے ہوئے آگے بڑھے، ان کی نظر "سیرت محمد علی" پر پڑی یہ میری پہلی تصنیف تھی، اسے میں نے طالب علمی ہی کے زمانہ میں ترتیب دیا تھا اور ابھی شائع ہوئی تھی، اب علامہ سے میرا مزید تعارف ہوا، "سیرت محمد علی" مصنف بھی یہی ہیں!

حضرت علامہ رک گئے، کتاب اٹھائی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ نہایت شفقت سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا، فرمایا: بہت سے واقعات میں محمد علی کے بارے میں ایسے بتا سکتا ہوں جو صرف مجھی کو معلوم ہیں۔ ان سے بھی فائدہ اٹھا لیتے! میں نے کہا ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔ میں تو ایسے نادر معلومات کا جویا ہوں، بات ختم ہوئی، علامہ آگے بڑھے، اور حلقہ اساتذہ میں جا کر بیٹھ گئے، میں طالب علموں کے ساتھ ایک گوشہ میں کھڑا ہوا نگاہ عقیدت سے ان کا نظارہ کر رہا تھا۔ اس وقت مجھے ان کی وہ نظم یاد آ رہی تھی، جو ۱۹۲۰ء میں انھوں نے "محمد علی شوکت علی" کی طویل نظر بندی اور سنداپا بی سے رہائی کے موقع پر کہی تھی:

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند	قطرۂ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند
مشک از فر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے	مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر — کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دامِ قفس سے بہرہ مند

"شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست

ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند!"

جس شاعرِ اعظم نے محمد علی کی عظمت کا ان بلند الفاظ میں اعتراف کیا، اس کے نادر معلومات یقیناً محمد علی سے متعلق خاص طور پر قابلِ اخذ و استفادہ ہوں گے، یہ سوچتے سوچتے مجھے اقبال کی وہ نظم یاد آگئی، جو اس نے "دریوزۂ خلافت" کے نام سے کہی تھی، یہ نظم اس وقت کہی گئی تھی، جب محمد علی "وفد خلافت" لے کر یورپ گئے تھے۔

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے — تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی

نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا — خلافت کی کرنے لگا تو گدائی

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے — مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی

"مرا از شکستن چناں عار ناید"

کہ از دیگراں خواستن مومیائی!"

کتنا خود دار ہے یہ شخص!

یہ وہ زمانہ تھا کہ "مسلم کانفرنس" مسلمانوں پر چھائی ہوئی تھی، عوام کو تو کچھ اس سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی، لیکن خواص، . . . . سر، خان بہادر، دولتمند . . . . اس محور کے گرد گردش کر رہے تھے، مسلم کانفرنس، مسلم سیاست پر اسی طرح اثر انداز تھی جس طرح آجکل مسلم لیگ نظر آ رہی ہے۔

سر آغا خان، اُس کے پہلے صدر تھے، سر محمد شفیع، سر ذوالفقار علی خاں اور اس نہج کے دوسرے ارباب ہمم اس کے خاص الخاص کارکنوں میں تھے۔ اب اس کی صدارت پر اقبال فائز تھے، یہ صدارت اقبال کے لئے باعث اعزاز نہیں تھی، البتہ مرحوم مسلم کانفرنس کی روح تا ابد اس پر نازاں رہے گی کہ اس کی صدارت کی کرسی پر، مشرق کا سب سے بڑا شاعر حیات متمکن ہو چکا ہے۔

اسی مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا جلسہ تھا۔ اقبال لاہور سے دہلی آئے۔ اب کی دہلی میں مولوی محمد شفیع داؤدی ایم، ایل۔ اے کی قیام گاہ پر مقیم ہوئے۔ شام کو میں محمد علی ہوسٹل سے کسی کام سے جا رہا تھا کہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب سے ملاقات ہوئی، موصوف نئی دہلی اقبال سے ملنے تشریف لئے جا رہے تھے۔ از راہ کرم گستری مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ ہم لوگ نئی دہلی پہنچے، شفیع داؤدی صاحب کی قیامگاہ پر اس وقت بہت سے لوگ جمع تھے، مسلم لیگ کے لیڈر، مسلم کانفرنس کے رہنما، خلافت کے پرانے کارکن، مرکزی اسمبلی کے ممبر، اور بعض وہ لوگ بھی موجود تھے جو برطانوی ہند کی سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ مثلاً مسٹر شعیب قریشی،

علامہ اپنے کمرے سے تشریف لائے، کسی سے معانقہ، کسی سے مصافحہ، کسی سے آنکھوں آنکھوں میں پیام سلام ہوا، سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے، اور باتیں شروع ہو گئیں۔

کچھ دیر بعد علامہ نے ڈاکٹر عابد حسین صاحب کی طرف رجوع کیا، اور گفت گو شروع ہو گئی، گفتگو کا موضوع سیاسی نہیں تھا، علمی اور تاریخی تھا۔ باتوں باتوں میں ہر قسم کے مباحث چھڑ جاتے تھے۔ علامہ کی گفتگو کا عام انداز یہ تھا کہ گفتگو اردو میں شروع کرتے

تھے، اور بہت جلد انگریزی پر آجاتے تھے۔ پھر کبھی انگریزی میں بات کرتے رہتے، کبھی اُردو میں تقریباً دو گھنٹہ تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ اس عرصہ میں نہ معلوم کتنے مباحث پر گفتگو ہوئی، لیکن ہر مبحث پر اتنی جامع و مانع، اتنی مکمل، اتنی سیر حاصل اور اتنی شگفتہ گفتگو ہوئی کہ میں تو علامہ کی حاضر دماغی برجستہ گوئی، وسعتِ علم، اور بلندی فکر پر عش عش کر گیا۔ اقبالؔ کی شاعری، اُن کی فلسفہ دانی، ان کی قابلیت، ان میں سے ہر چیز اصول موضوعہ کی طرح اپنی جگہ پر مسلّم تھی، لیکن یہ آج اندازہ ہوا کہ نجی کی صحبتوں میں بھی اقبال کی شخصیت کتنی دِل آویز، کتنی پر کشش اور کتنی سحر طراز تھی؟

اس مجمع میں بڑے بڑے اہلِ علم و دانش موجود تھے۔ بڑے بڑے مفکر اور سیاس موجود تھے بڑے بڑے نکتہ رس اور ہمہ داں موجود تھے، بڑے بڑے دانا و بینا اور اربابِ بینش موجود تھے۔ لیکن اقبالؔ کے علم، اس کی ہمہ دانی، اس کی معرفت، اور اس کے داب دانش کے سامنے سب طفلِ مکتب معلوم ہو رہے تھے۔ مجھے "کتاب الاغانی" کا وہ قصہ یاد آگیا جب عہد ہارون الرشید کے مشہور مغنی ابراہیم موصلی نے اپنے بیٹے اسحٰق کو اس عہد کے کامل فن ماہر غنا ابن جامع سے ملایا تھا، ابن جامع نے باپ بیٹے کی فرمائش سے مجبور ہو کر اپنے راگ سنائے مجلس ختم ہوئی اور یہ دونوں واپس آگئے، راستہ میں ابراہیم نے اسحٰق سے پوچھا "کہو بیٹا ابن جامع کو کیا پایا؟" اسحٰق نے کہا اگر آپ ناراض نہ ہوں تو عرض کروں؟ ابراہیم نے پھر اصرار کیا تو اسحٰق نے کہا "آپ سے بڑھ کر راگ راگنی کے فن میں کسی کو بھی میں نہیں سمجھتا تھا، لیکن ابن جامع کو سُننے کے بعد آپ کچھ نہیں رہے۔"

یہی حال میرا تھا۔ اس مجمع میں متعدد اصحاب ایسے تھے، جن کے علم و فضل، مہارت و قابلیت، ذہانت و ذکاوت کا میرے دِل پر سکہ بیٹھا ہوا تھا، لیکن اس مجلس میں سب

"طفل کم سواد" نظر آرہے تھے، اور اقبال ایک یگانہ شخصیت کی طرح جلوہ آرا تھا، جو سب پر چھایا ہوا تھا، سب جس کے سامنے گردن جھکائے ہوتے تھے۔

۳۳ء میں عالم اسلام کی مایہ ناز شخصیت غازی رؤف پاشا کو ڈاکٹر انصاری مرحوم امیر چانسلر جامعہ نے دہلی آکر توسیعی خطبات دینے کی دعوت دی، رؤف پاشا نے یہ دعوت بہ مسرت منظور کر لی اور ہندوستان کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے انہوں نے مشرف فرمایا۔

رؤف پاشا خلافت عثمانیہ کے دور میں ممتاز اور نمایاں شخصیت رکھتے تھے حمیدیہ جہاز کے سلسلہ میں انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے، ان سے ایک دنیا واقف ہے، یہ خلیفۃ المسلمین کی حکومت کے امیر البحر تھے۔ پھر انقلاب کے بعد بھی یہ ترکی میں بڑے بڑے مناصب پر فائز ہوئے، لبعد میں مصطفےٰ کمال پاشا سے اور ان سے اختلاف ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ترکی چھوڑ کر ایک جلاوطن کی طرح پیرس میں بسنے لگے۔

قبل اس کے کہ رؤف پاشا ہندوستان پہنچیں ان کا نام نامی ہندوستان پہنچ چکا تھا، مسلمان تو مسلمان ہندوستان کے غیر مسلم بھی اُن کی شخصیت میں غیر معمولی جذب و کشش محسوس کر رہے تھے۔ جامعہ میں اُن کے لیکچروں کا سلسلہ شروع ہوا، تو ہجوم کا یہ عالم تھا کہ ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ کئی روز تک خطبات کا سلسلہ جاری رہا ہر روز صدارت کے فرائض اسلامی ہند کی کوئی مقتدر شخصیت انجام دیتی تھی۔

ایک جلسہ کی صدارت علامہ اقبال نے فرمائی۔ جلسہ رات کو تھا۔ علامہ صبح فرنٹیئر میل سے تشریف لے آئے، جامعہ کے طلبا اور اساتذہ کی ایک بڑی تعداد دہلی کے اسٹیشن پر استقبال کے لئے موجود تھی، اس مرتبہ علامہ نے غالباً پروفیسر محمد مجیب جی کی

کوٹھی (ستہ ول باغ) پر قیام فرمایا۔

جلسہ کا وقت آگیا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، تھالی پھینکئے تو سر ہی سر جائے۔ ایک تو رؤف پاشا کی دلربا شخصیت۔ دوسرے اقبال کی صدارت، سونے پر سہاگہ، آج ہجوم اور زیادہ تھا، بہت زیادہ تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مدظلہٗ (شیخ الجامعہ) نے ایک نہایت ہی فصیح و بلیغ اور زبردست تقریر میں پہلے اقبال کی شخصیت اور اس کی شاعری کا تعارف کرایا، پھر صدارت کے لئے ان کا نام پیش کیا۔

توقع تھی کہ اقبال اردو میں تقریر کریں گے۔ لیکن اُنہوں نے شاید مجمع کی مناسبت سے انگریزی ہی کو تقریر کے لئے پسند کیا۔ بڑی معرکہ آرا تقریر کی علامہ نے اس مجمع میں

ابھی کچھ عرصہ پیشتر علامہ سفر یورپ سے واپس آئے تھے۔ تیسری گول میز کانفرنس میں وہ مندوب کی حیثیت سے حکومت ہند کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔ گول میز کانفرنس کے بعد علامہ نے اپنی ایک دیرینہ آرزو بھی پوری کی، یعنی اسپین کی سیاحت یہ وہ سرزمین تھی۔ جہاں صدیوں مسلمانوں نے حکومت کی تھی، بادشاہت کی تھی۔ اور وہ بھی اس جاہ و جلال کے ساتھ کہ دیارِ فرنگ ان کے نام سے لرزہ براندام ہو جاتا تھا۔

اب اسپین میں مسلمانوں کا وجود ختم ہو چکا ہے، اُن کی حکومت قصۂ ماضی بن چکی ہے۔ لیکن اب بھی وہاں کے چپہ چپہ پر مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کے ثقافت کے نشانات موجود ہیں۔ اَب بھی وہاں قصر الحمرا کے کھنڈر، مسجد زہرہ کے باقیات الصالحات، اور عہدِ اسلامی کی تعمیرات کے آثار موجود ہیں۔

اقبال ابھی ابھی اس سفر سے واپس آئے تھے، تاثرات تازہ تھے اور وہ اشعار کی صورت اختیار کر رہے تھے، اُن کی نظم "ہسپانیہ" ابھی منظر عام پر نہیں آئی تھی، لیکن

محرمانِ راز اَور خلوتیانِ حرم کی معرفت ایک آدھ شعر، حکومت سے خلوت سے جلوت میں آچکا تھا۔

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے — مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں — خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں
روشن تھیں ستاروں کی طرح اُنکی سنانیں — خیمے تھے کبھی جنکے ترے کوہ و کمر میں
پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی — باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں
کیونکر خس و خاشاک سے دب جائے مسلماں — مانا وہ تب و تاب نہیں اس کے شرر میں
غرناطہ بھی دیکھا مری آنکھوں نے ولیکن — تسکینِ مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں
دیکھا بھی دکھایا بھی سنایا بھی سنا بھی — ہے دل کی تسلی نہ نظر میں نہ خبر میں

اب اقبال کی شاعری پھر اُردو کا جامۂ حریر پہن رہی تھی۔

بہرحال اقبال نے تقریر شروع کی، سارا مجمع گوش بر آواز تھا۔

اس تقریر میں اُنہوں نے فرانس کے مشہور فلسفی برگساں سے بھی اپنی ملاقات کا ذکر کیا اَور فرمایا، جب میں نے اُسے "لاتسبوا الدہر و انا الدہر" (یعنی خدا کہتا ہے، زمانہ کو بُرا نہ کہو میں خود زمانہ ہوں) سُنایا تو وہ اسلام کے اس فلسفہ پر بھونچکا رہ گیا۔

اسی تقریر میں اُنہوں نے اپنے چند تازہ اشعار بھی سنائے۔ لیکن اس لحن اور طرز میں نہیں، جس کی گونج انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں اکثر و بیشتر سُنی جاتی تھی، بلکہ تحت اللفظ، لیکن اس تحت اللفظ میں بھی جو اثر، جو کیف جو جادو تھا اُسے سُننے والے اب تک نہیں بھولے ہیں۔ نہ شاید کبھی بھول سکیں۔

قبل اس کے کہ وہ اشعار درج کئے جائیں، اُن کا پس منظر بھی اگر پیش کر دیا

تو مناسب نہ ہو گا۔

اسپین پر ایک عرصہ دراز تک مسلمانوں نے حکومت کی۔ اس دوران میں وہ وہاں اجنبی نہیں رہے بلکہ گھُل مِل گئے۔ عیسائی خاندانوں سے اُنہوں نے رشتہ ازدواج بھی قائم کیا، پھر وہ دَور آیا کہ مسلمانوں کی نا اتفاقی اور باہمی مخالفت کی وجہ سے اُن کا شیرازہ بکھر گیا، اور وہ اندلسی حکومت جس کی طرف یوَرپ کی بڑی بڑی حکومتیں نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتی تھیں، اور جس کی عظمت، ہیبت دبدبہ، سطوت اور جلال کا یہ عالم تھا کہ سارا فرنگستان اُن سے بید لرزاں کی طرح کانپتا تھا، اسپین پر ٹوٹ پڑا، اور اسلامی حکومت ختم ہو گئی۔ صرف یہی نہیں ہوا کہ اسلامی حکومت ختم ہو گئی، بلکہ یہ بھی ہوا کہ مسلمان بھی وہاں سے نکال دیئے گئے۔ یہ الجزائر، ٹیونس، رلیف وغیرہ کے عربوں کا جو نام آپ سنتے ہیں یہ زیادہ تر وہیں کے خاندان ہیں، جو اسپین سے ہجرت کر کے، یا جلاوطن کر کے یہاں بھیجے گئے۔ اور پھر یہیں کے ہو رہے۔

لیکن کچھ خاندان ایسے بھی تھے، جو اسپین ہی رہ گئے اور وہاں کے نئے ماحول سے اتنے متاثر اور مرعوب ہوئے کہ اُنہوں نے عیسائی مذہب بھی قبول کر لیا۔

عربی زبان کے ایک مشہور انشاپرداز نے ایک مختصر لیکن بلند پایہ کتاب "اندلس کا ماضی اور حال" کے عنوان سے لکھی تھی۔ اس کتاب میں بہت سے اہم اور دلچسپ مباحث پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب میں یہ انکشاف بھی ہے کہ قدیم عرب خاندان جو بعد میں عیسائی ہوئے تھے۔ آج بھی اسپین میں موجود ہیں، وہ اب بھی وہاں عیش و نشاط کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دولت و امارت اُن کے گھر کی لونڈی ہے، وہ لارڈ ہیں، نواب ہیں، جاگیردار ہیں، زمیندار ہیں، دولت مند ہیں، اور وہاں کی سیاسی اور سماجی زندگی پر

اثر رکھتے ہیں - انہیں اس پر فخر ہے کہ ان کی رگوں میں عرب خون دوڑ رہا ہے، بعض خاندان تو ایسے ہیں جو اپنے "صدیقی" اور "فاروقی" ہونے پر نازاں ہیں -

شاعر مشرق، جب اندلس پہنچا تو صرف ایک عام زائر اور سیاح کی حیثیت سے اس نے کوچہ گردی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ بہ نظرِ غائر وہاں کے لوگوں کا، ان کے رہنے سہنے کا، ان کے طور طریق کا، ان کے اصول اور ضابطہ کا مطالعہ کیا - اس کی آنکھوں نے بھی وہی دیکھا، اور پایا جس کی طرف کچھ عرصہ پیشتر ایک عرب مصنف اور انشاپرداز اپنی ایک مایہ ناز تصنیف میں اشارہ کر چکا تھا، اور اپنے تاثرات کو ایسے الفاظ میں قلمبند کیا کہ پڑھنے والے ہمیشہ پڑھیں گے اور روئیں گے، سننے والے سنیں گے اور سر دھنیں گے۔

اقبال نے اس جلسہ میں جو اشعار سنائے، وہ ایک طویل نظم "مسجد قرطبہ" کا ایک حصّہ تھے، یہ وہ مسجد ہے، جو آج بھی موجود ہے اور اپنی گذشتہ عظمت کا فسانہ زبانِ درد سے سنا رہی ہے وہ اشعار جو اقبال نے اس مجمع میں سنائے یہ ہیں :-

کعبہ اربابِ فن، سطوتِ دین مبیں
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلب مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں
آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار
حامل "خلق عظیم"! صاحبِ صدق و یقیں

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنت اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں
جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب
ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں
جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل و گرم اختلاط سادۂ روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں
بوئے یمن آج بھی اُس کی ہواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اُس کی نواؤں میں ہے
دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں
آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں
دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاح دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں عہدِ کہن کے نشاں
حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت
اور ہوئی فکر کی کشتیٔ نازک رواں

چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملّتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذّتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں
روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں!
دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

یہ اشعار اقبالؔ نے ترنّم سے نہیں پڑھے تھے بلکہ تحت اللفظ اُنہیں پڑھا تھا۔ پھر بھی تاثر کا یہ عالم تھا کہ مجمع پر سنّاٹا چھایا ہوا تھا کانّ علی رؤسہم الطیر!

مجھے اقبالؔ سے ملاقات، یا اخباری زبان میں "انٹرویو" کی سعادت نہیں حاصل ہوئی، البتہ مجھے اُن کے نظّارہ کا دو ایک مرتبہ موقعہ ملا۔ یہ تاثرات و نقوش، اسی اجمال کی تفسیر ہیں۔

اقبال کی شاعری

سرودے، نالہ، آہ و فغانے!

اقبال کی شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا، وہ

سرودے، نالہ، آہ و فغانے!

پر مشتمل ہے! اقبال کی شاعری سرود و نغمہ بھی ہے نالہ و فغاں بھی، اور آہ و شیون بھی!
شروع میں اس کی شاعری میں آہ و شیون کے ساتھ نغمہ و سرود کا رنگ بھی شامل تھا، وہ اگر ملک و قوم کے حال پر آنسو بہاتا تھا، تو بہار کی رعنائیاں اور موسم گل کی طرب زائیاں حسن بے محابا کی رنگینیاں جلوہ عام کی دلربائیاں، کوہ و دشت کے مناظر، باغ دلنما کی کیفیتیں، کنار آب اور لب جوئبار کی کیف آفرینیاں، جگنو کی چمک، تاروں کا تبسم کہکشاں کا روپ، اور چاند کی چاندنی بھی اس کا دل اپنی طرف کھینچتی تھی۔ وہ مجمع احباب میں!

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

کا مصداق بنکر نہیں پہنچتا تھا، بلکہ بلبل ہزار داستاں کی طرح نغمہ سرائی کرتا تھا اس کے ترنم سے جلسوں کے پنڈال اور بزم احباب کے در و دیوار گونجا کرتے تھے۔
پھر بعد میں وہ دور آیا کہ اقبال کی شاعری یکسر آہ و نالہ، یکسر فغان و شیون،

یکسر درد و کرب، یکسر الم و التہاب بن کر رہ گئی، وہ خود روتا تھا، اور دوسروں کو رُلاتا تھا۔ اب اس کا پیام ایک ہی رہ گیا تھا ؎

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

وہ ہندوستان کا ایسا شاعر نہیں تھا جو صرف گل و بلبل کے افسانے سناتا ہے، جو تیرِ نظر اور سنانِ نگاہ کا مرثیہ خواں ہوتا ہے۔ جو دردِ دل اور فغانِ جگر کا علمبردار ہوتا ہے، جو فسانۂ غمِ دل اور داستانِ رنجوریِ تن کا نام دار ہوتا ہے۔ جو کنگھی چوٹی، سرمہ اور کاجل، انگیا اور موباف میں لپٹا رہتا ہے، جو ہجر کی داستان بیان کرتا ہے، تو مبالغہ کی ساری قوت صرف کر دیتا ہے۔ وصال کا کہا سُناتا ہے تو ہر غم بھول جاتا ہے جو

ع۔ عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن!

کا مظہر تمام بن کر رہ جاتا ہے، جو اپنے معشوق کے جور و ستم کا حال بیان کرتا ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے نمرود و فرعون، چنگیز و ہلاکو، سکندر اور یزید، ہٹلر اور مسولینی، اس کے شاگردِ رشید ہیں۔ رقیب کی کامیابیوں اور کامرانیوں کا ذکر کرتا ہے۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رقیب اور محبوب گلے مل رہے ہیں، راز و نیاز میں مصروف ہیں، سرگرمِ اختلاط ہیں۔ اور یہ عاشقِ دل فگار، اپنی چشمِ مجبور سے یہ تماشا دیکھ رہا ہے، پھر بھی محبت کا یہ عالم ہے کہ عشق سے دستبردار ہونے کا نام نہیں لیتا۔ اپنے عشق کا میاب کو موضوعِ انجمن بناتا ہے تو اس طرح کہ، ؎

تم جسے یاد کرو پھر اسے کیا یاد رہے
نہ خدائی کی ہو پروا نہ خدا یاد رہے

وہ یہ نہیں جانتا ہے کہ اس دُنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ اسے یہ نہیں معلوم کہ اس کے دیس پر کیا گذر رہی ہے وہ اس سے ناآشنا ہوتا ہے کہ اس کی ملت کس مصیبت میں گرفتار ہے، اسے اس کی پروا نہیں ہوتی کہ اس کے ابنائے ملت کس دور سے گذر رہے ہیں۔ اسے اس کا اندیشہ نہیں ہوتا کہ کوئی انقلاب آرہا ہے؟ یا نہیں؟ آرہا ہے تو اس کے جلو میں کیا ہے؟ اگر انقلاب خون بہاتا ہوا آگ برساتا ہوا، ہڈیاں روندتا ہوا آبھی جاتا ہے، تو بھی وہ شراب محبت میں مست رہتا ہے، اس کی دُنیا اس بھنگے کی دُنیا ہے جو گولر میں بند رہتا ہے۔ اور قطعاً نہیں جانتا کہ اس چاردیواری سے باہر کیا ہو رہا ہے؟ جو علم و دانش کی دُنیا کا سیاح بھی نہیں ہوتا، بالعموم یہ بھی نہیں جانتا کہ تاریخ کا اشارہ کیا ہے؟ فلسفہ کی تعلیم کیا ہے؟ نفسیات انسانی کا اقتضا کیا ہے؟ عقد اجتماعی کا محور و مرکز کیا ہے؟ قیصریت کیا ہے؟ اشتراکیت ہے؟ فاسطیت کیا ہے جمہوریت کیا ہے؟ اور ان سب کے اثرات قوم و ملک پر کس طرح اور کیا مترتب ہوتے ہیں؟ اور اگر کبھی اتفاقاً اور بر سبیل تذکرہ وہ قیصریت کے بارے میں کچھ کہتا ہے، تو طفل دبستاں کی طرح بے ہنگم باتیں اشتراکیت کے باب میں اس کا نطق رنگیں تصور کی رنگینی سے آگے نہیں بڑھتا، فاسطیت کی بنیاد و اساس بھی اس کے ذہن و دماغ سے ماورا ہے اور جمہوریت کے نشان قدم پر اگر وہ چلتا بھی ہے، تو گر گر کر،

لیکن شاعروں کے اس ہجوم عام میں اقبال سب سے الگ ہے، سب سے ممتاز ہے، سب میں منفرد ہے۔ اس کی انفرادیت کا وقار ایسا نہیں جسے نظر انداز کیا جا سکے۔

وہ ایک بالغ نظر شاعر ہے، اس کے علم کا یہ حال ہے کہ وہ مشرق و مغرب کا سنگم ہے اس کا بچپن مشرق کے گہوارہ میں گذرا ہے، اور جوانی مغرب کے کفر ساماں ماحول میں بسر ہوئی ہے۔ اس نے جس ذوق سے مشرق کا فلسفہ پڑھا ہے، اس سے کہیں زیادہ شوق سے فلسفۂ مغرب کا درس لیا ہے۔ وہ جس طرح ایشیا کے علوم کا ماہر ہے۔ اسی طرح یورپ کے علوم بھی اس کے دماغ میں بسے ہوئے ہیں، وہ علم کو قید مقامی سے آزاد سمجھتا ہے، اسی لئے جہاں کہیں بھی اسے علم ملتا ہے لے لیتا ہے، وہ علم کا کوئی گوشہ چھوڑتا نہیں، وہ تاریخ پر نظر رکھتا ہے، فلسفہ کا وہ امام ہے، اقتصادیات پر اس کی گہری نگاہ ہے۔ علم الاقوام بھی اس کے ذہن و دماغ میں رچا ہوا ہے، وہ دُنیا کے نئے رجحانات اور تصورات سے بھی ناواقف نہیں ہے، وہ قیصریت کا بھی ادا شناس ہے، وہ فاسقیت کے رموز بھی جانتا ہے، وہ جمہوریت کے اسرار کا بھی ماہر ہے وہ اشتراکیت کی گہرائیوں میں بھی غوطے لگا چکا ہے، غرض دُنیا کی کوئی تحریک کوئی رجحان کوئی تصور ایسا نہیں ہے، جس سے اقبال واقف نہ ہو، جس کا اقبال نے مطالعہ نہ کیا ہو؟ جس کے محرکات پر اقبال کی نظر نہ ہو، وہ سنساری اور مقامی، نظریات جدید و قدیم کو بھی جانتا ہے۔ انہیں پرکھ چکا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری صرف غزل (گفتگو با محبوب) نہیں ہے اس کی شاعری قصیدہ نہیں ہے، اس کی شاعری دردِ دل کا نسخۂ پیچیدہ، اور ہجر و وصال کی طلسم ہوشربا نہیں ہے۔ اس کی شاعری چشمِ میگوں۔ ساقِ سیمیں، ساعدِ نازک رُخِ تاباں، گیسوئے پُر خم چہرۂ زیبا، خرامِ ناز، اور گلگونۂ عارض کی پیمائش نہیں ہے،

وہ عاشق ہے لیکن کس کا؟

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا!

وہ اِنسان کا، قدرت کی آخری ہنرمندی کا، خالق موجودات کے شاہکار کا، خدا کی سب سے زیادہ حسین مخلوق کا ــــ انسان کا ــــ عاشق ہے۔

اس کی شاعری کا موضوع صرف یہ ہے کہ انسان کا دُکھ درد دُور ہو جائے، وہ سکھ اور چین کی زندگی بسر کرے۔ اس پر ظلم نہ ہو، اس پر ستم نہ ڈھائے جائیں، اس کی آزادی مجروح نہ کی جائے، اس پر ناروا پابندیاں نہ عائد ہوں۔ اس کی شخصی اور ملّی زندگی جنت کا نمونہ ہو، نہ کوئی فکر ہو، نہ کوئی اندیشہ! وہ جب یہ دیکھتا ہے کہ اِنسان اب تک "صید زبوں شہر یاری" ہے، تو تڑپ اُٹھتا ہے،

تعجب ہے کہ اِنساں اور انساں کا شکاری ہے!

وہ اسے دیکھ نہیں سکتا کہ انسان ہوں اور غیر مساوی زندگی بسر کر رہے ہوں، انسان ہوں اور ان میں اُونچ نیچ کی تفریق ہو، انسان ہوں اور کچھ قصر فلک بوس میں رہ رہے ہوں، اور بہت سے ایسے ہوں جنہیں سر چھپانے کو جھونپڑی بھی میسر نہ ہو، وہ جب یہ عدم مساوات، یہ تفریق، یہ ادنےٰ و اعلےٰ کا امتیاز، یہ تقسیم زر کا غیر عادلانہ اصول، یہ امارت اور غربت کی حد فاصل دیکھتا ہے تو اس کا دِل بے قرار ہو جاتا ہے، اور اس کا نالہ، نالۂ آتشیں بن جاتا ہے، پھر اس کے منہ سے شعر نہیں نکلتے، شرارے نکلتے ہیں، انگارے نکلتے ہیں، بھڑکتے ہوئے شعلے نکلتے ہیں۔

وہ اپنے وسیع علم، وسیع تجربہ اور وسیع تفکر و تدبر سے کام لے کر ایک راہِ عمل سوچتا ہے، وہ منزل ڈھونڈتا ہے جو انسان کو جہنم سے جنت میں پہنچا دیتی ہو، جو انسانیت کی تمام مصیبتوں کا خاتمہ کر دیتی ہو۔ جو اس کے ہر روگ کو دور کر دے۔

سوچنے والوں نے، انسانیت کے آزار کا علاج یہ سوچا کہ اگر قیصریت کو فروغ ہو تو دُنیا ہر دُکھ سے آزاد ہو جائے گی۔ بعض کو یہ الہام ہوا کہ اگر آمریت کا رواج دُنیا میں ہو جاتے، تو انسان دُکھی نہیں رہے گا، بعض مفکروں پر یہ القا ہوا کہ اگر جمہوریت کو فروغ ہو، تو دُکھی انسان دوا کے لئے بھی ڈھونڈا جائے تو دستیاب نہ ہو سکے گا۔ بعض نبض شناسانِ زمانہ نے انسانیت کے مرضِ مزمن کا علاج یہ سوچا کہ اشتراکیت کا نسخہ استعمال کیا جائے، اُسے استعمال کیا جائے، اُسے استعمال کرتے ہی مرض کافور ہو جائے گا، اور بیمار انسانیت تنومند ہو کر بسترِ مرگ سے اُٹھ کھڑی ہو گی۔

اقبال نے ان تمام تصورات و نظریات کو سوچا، جانچا، پرکھا، اور اپنے دماغ کے معمل (لیبورٹیری) میں ان کا تجزیہ اور تجزیہ کیا، اور اس نتیجہ پر پہنچا، کہ اِن نسخوں میں کوئی بھی نسخہ ایسا تیر بہدف نہیں ہے کہ جملہ امراض کو دُور کر دے، حکمائے عصر کی قرابا دیں، اور اطبائے حاذق کے صدری اور خاندانی نسخوں کی بھی اس نے خوب پڑتال کی، لیکن گوہرِ مقصود کی تلاش میں وہ ناکام رہا۔

آخر ایک عرصہ کے غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ دُنیا کے ہر روگ کا علاج "اسلام" ہے۔

اس کے علم نے، اس کی بصیرت نے اس کے تجربہ اور مشاہدہ نے اُسے بتایا کہ

دُنیا میں "قلبِ مُسلماں" سے زیادہ حسین و جمیل کوئی چیز نہیں، "نگاہ مسلم" سے زیادہ زلزلہ فگن، اور نعرۂ تکبیر سے زیادہ شکن کوئی ہتھیار نہیں، ضربتِ خالدؓ اور زورِ حیدرؓ کا راز صرف "اسلام" ہے! لہٰذا کیوں نہ یہی نسخہ استعمال کیا جائے؟ کیوں نہ پھر اس کا تجربہ کیا جائے؟ کیوں نہ ایک بار اور یہ آزمائی ہوئی اکسیر پھر آزمائی جائے؟ وہ تریاق جس سے جاں بلب اور لبِ گور، حیاتِ نو سے آشنا ہو لے۔ اور پھر جن کے نعرۂ تکبیر سے دُنیا دہل اُٹھی۔ جن کے زورِ بازو سے عالم لرز گیا۔ جن کے عدل و انصاف کی یہ ہفت اقلیم گواہ ہے کیا وہ تریاق، آج کی بیمار و زار دُنیا کے کام نہ آئے گا؟ کیا وہ نظریہ جو تجربہ کی پشت پناہی کے ساتھ ۱۳ سو برس سے آزمایا جا رہا ہے۔ ان نظریات کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکے گا؛ جو نو زائیدہ ہیں، جن کی افادیت مشکوک ہے؟ جو اپنے روشن پہلو کے ساتھ تاریک پہلو بھی رکھتے ہیں؛ اور بعض اوقات جنہیں ایک دوسرے پر ترجیح دینا مشکل ہو جاتا ہے؟

یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر وہ اُٹھا اور اس نے،

ع مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ!

کی تنبیہہ کرکے، اپنا پیام، ـــــ صلح و سلام کا پیام ـــــ دُنیا کے نام دُنیا شروع کر دیا۔ کیا تھا وہ پیام؟

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

دُنیا کے دوسرے فلسفیوں نے "انسانِ اعلےٰ" (سوپرمین) کے نظریے پیش کئے، لیکن وہ نظریہ کی حد سے آگے نہ بڑھ سکے، اقبال کا انسانِ اعلےٰ (مردِ مسلمان)، تاریخ کا دیکھا ہوا، نسلوں کا پرکھا ہوا، صدیوں کا آزمایا ہوا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ فلسفی اپنے سوپر مین کو اس حسن و خوبی، اس رعنائی و دلکشی، اس زیبائی اور شانِ جمال کے ساتھ نہ پیش کر سکے، جو اقبال کا حصہ ہے، اقبال کا مردِ مسلمان رازِ قدرت ہے، جو دنیا میں براگندہ نقاب ہو کر اس لئے آیا ہے کہ دنیا کا ہر دکھ، اس کا ہر روگ اور اس کا ہر آزار دور کر دے!

بس! یہ ہے اقبال کا پیام، یہ ہے اس کی شاعری، یہ ہے اس مردِ قلندر کی "نوائے پریشاں"! ❖

اِقبالؔ کا اِحتساب

صرف اَدبی نقطۂ نظر سے

اقبالؔ کا علمی پایہ، اور اُن کی فلسفیانہ حیثیت اور اُن کی شاعری کا مخصوص پیام اِتنا بلند، اِتنا ارفع و اعلےٰ اور اِتنا متفق علیہ ہے کہ اس سے نہ سخن فہموں کو انکار ہے نہ سخن ناشناسوں کو، بلکہ اقبالؔ کی یہ حیثیت اتنی مرعوب کُن ہو چکی ہے کہ آپ کو ایسے لوگ بھی ملیں گے جو شعر اقبالؔ کا مفہوم و معنی بالکل نہیں سمجھیں گے، لیکن جھومیں گے، سر دھنیں گے "رائے نامہ" کا اثر ایسا ہی ہوتا ہے، غالبؔ کی عظمت مسلّم ہے۔ اس کی یہ عظمت اس کے دقیق اور مشکل اشعار کی بنا پر نہیں ہے، مثلاً اہلِ نظر غالبؔ کا شعر

شمار سبحہ مرغوب بُتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

پڑھیں گے، اور گذر جائیں گے۔ لیکن جب اس کا کوئی وہ شعر نظر سے گذرے گا جو سہل ممتنع کا حامل ہو، مثلاً

درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا
عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

تو واقعی وفورِ کیف سے بے خود ہو جائیں گے، لیکن غالبؔ سے مرعوبیت اس درجہ تک

پہنچ چکی ہے کہ اگر کوئی اس کا دقیق، مشکل، گنجلک شعر سنیں گے تو اس معرفت سے داد دیں گے، گویا ان پر چودہ طبق روشن ہو گئے ہیں، یہی کیفیت لوگوں کی کلام اقبالؔ کے ساتھ ہے۔

لیکن اس گروہِ عام سے ہٹ کر ایک گروہ بھی ہے، جو اقبال کی قابلیت و ذہانت کا معترف ہے، اس کی بلند پروازی، اور ندرت خیال کا ثنا خواں ہے۔ اس کی مضمون آفرینی اور حسنِ اسلوب کا مداح ہے لیکن اس کی "زبان" کو غلط سمجھتا ہے! اس کے علم اور فلسفہ کا قائل ہے، لیکن اس کی "ادبیت" شائستہ التفات نہیں سمجھتا۔

یہ وہ گروہ ہے، جو اپنے تئیں، زبان کا امام، اور لغت کا "خسروِ بے کلہ"، سمجھتا ہے، وہ کہتا ہے ؎

میں حقیر گدایانِ قوم راکیں قوم
شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند

یہ کاکل پیچاں اور زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہے، یہ چشم فتاں، اور خنجر نگاہ کا گھائل ہے، یہ عارض روشن اور "تمثال حور مثال" کا پجاری ہے جو اس کے ہم مشرب ہوں، ان سے دور بھاگتا ہے، جو جدت و تجدد کے قائل ہوں، جو فطرت کی گہرائیوں اور نبض انسانی کی دھڑکنوں کے محرم اسرار ہوں، یہ اپنی بولی کو چمن کی زبان سمجھتا ہے، اور دوسروں کی نوائے پریشاں کو یہ شور و ہنگامہ سمجھتا ہے، یہ اپنی زبان کو کوثر کی دھلی ہوئی زبان سمجھتا ہے، اور دوسروں کی زبان اس کے نزدیک بارِ سماعت ہے،

اس گروہ نے اقبالؔ کی ادبیت اس کی زبان دانی، اور امثال و محاورات سے اس کی ناواقفیت کا نقارہ اس زور سے بجایا کہ زبان و لغت کی دنیا دہل اٹھی، مخالفت

بے پناہ، مخالفت کا گرد و غبار ایسا اُٹھا کہ اقبالؔ کی ادبیت کا چہرہ روشن اس تاریکی میں چھُپ گیا، اس کا رُوئے خوب، مخالفت کے غبار میں اوجھل ہو گیا اس کے ادبی صنائع و بدائع اس خوب اور ناخوب کی بحث میں، خزف ریزوں سے بھی بدتر ہو گئے، وہ جواہر تھے لیکن اُن کی تمیز اور پہچان مشکل ہو گئی۔

اقبالؔ کی شاعری، اس کے پیام، اس کے فلسفہ اس کے نظریات سیاسی اور تصورات اسلامی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اس کے پیام، اور فلسفہ کے ان پہلوؤں کی "رونمائی" اور "نقاب کشائی" عرصہ سے ہو رہی ہے، اس کی شاعری کے یہ وہ رُخ ہیں جن کا نظارہ دُنیا عرصہ سے کر رہی ہے، اور نظارہ کرتے کرتے اُن کی ماہیت اور حقیقت سے بھی آشنا ہو چکی ہے۔

یوں تو اقبالؔ کی شاعری "کتاب دل" کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس کے متعلق خود اقبال کہہ چکے ہیں۔

ع۔ لکھی جائیں گی "کتابِ دِل کی تفسیریں بہت!"

چنانچہ اُن کے کلام کی شرح و تفسیر کا سلسلہ جاری ہے اور جب تک اُردو زبان باقی ہے، نئے نئے پہلوؤں اور زاویوں سے اس کا سلسلہ جاری بھی رہے گا، "مثنوی مولوی معنوی" اب تک تازہ ہے اور تا ابد تازہ رہے گی، اسی طرح اقبالؔ کا کلام اب بھی تازہ ہے اور اس کی تازگی ہمیشہ قائم رہے گی۔

میرا خیال ہے کہ اقبالؔ کی شاعری پر صرف ادبی نقطۂ نظر سے اب تک بحث نہیں کی گئی ہے، اور یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ صرف اقبالؔ کے ساتھ نہیں، بلکہ اَدب کے ساتھ بھی، حقیقت یہ ہے کہ اگر نگاہ غور سے دیکھا جائے تو اقبالؔ کا ادبی پہلو بھی اِتنا

درخشاں، اتنا تاباں، اَور اتنا نظر فروز ہے کہ نہ اُسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے، نہ اُس کی جدت، تجدد، اَور ادبی امتیاز کو فراموش کیا جاسکتا ہے، یہ وہ ہیرے ہیں جو منوں مٹی کے نیچے دبے ہوئے ہیں، مٹی کا ڈھیر ہٹادیا جائے۔ تو یہ نمایاں ہو جائیں گے، اور ان کی چمک دمک سے آنکھیں خیرہ ہونے لگیں گی، جھوٹے موتی بھی آب دکھاتے اور چمکتے ہیں، لیکن سچے موتیوں کے سامنے ان کا پانی مرجاتا ہے، اَور اُن کی آب ختم ہو جاتی ہے، اقبالؔ کے سچے موتیوں کو اگر عصرِ حاضر کے جھوٹے موتیوں کے سامنے رکھا جائے تو فوراً نگاہ جوہر شناس تاڑ لے گی کہ حقیقت کیا ہے اور کہاں ہے؟

صرف ادبی نقطہ نظر سے اگر اقبالؔ کی شاعری کا احتساب کیا جائے تو بہت سے جواہر پارے ملیں گے۔ جن کے متعلق ہرگز یہ نہیں کہا جاسکتا کہ

یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے!

بلکہ جو اپنی آب وتاب اور چمک دمک کے اعتبار سے "خاصے" کی چیز ہیں۔

اب ہم مختلف عنوانات کے ماتحت اقبالؔ کی ادبی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں۔

حقائق، معارف، فلسفہ

اقبال زبانِ شعر میں حقائق و معارف بھی بیان کرتا ہے، جنہیں ہم محسوس کرتے ہیں لیکن کہہ نہیں پاتے، جن سے ہمارا دل آشنا ہے، لیکن زبان سے جن کی تفسیر نہیں کرسکتے۔ جو ہمارے سامنے گذرتے رہتے ہیں، لیکن ہم ان میں امتیاز نہیں کرتے، شاعر ان حقائق کو اس طرح، اس سادگی اور اس روانی سے بیان کرتا چلا جاتا ہے، گویا ایک معمولی بات کہہ دی۔ لیکن وہی معمولی سی بات جانِ سخن ہوتی ہے!

ہم آپ ہر روز موت کی کارفرمائیاں بے بسی کے ساتھ دیکھتے رہتے ہیں، دیکھتے ہیں اور رو لیتے ہیں، اور خاموش ہو جاتے ہیں، لیکن اقبالؔ اس موت کی ہمہ گیری میں بھی "آرٹ" دیکھتا ہے، قدرت کے ذوق جستجو کو پا لیتا ہے، وہ کہتا ہے، ہوا اگر حباب پیدا کرنے پر، دوبارہ اسے بنا لینے پر قادر نہ ہو، تو حباب کو اتنی بے پروائی سے مٹاتی کیوں؟ قدرت، انسان کو فنا کر کے اُسے حیاتِ نو سے نہ آشنا کر سکتی ہوتی، تو موت اتنی ارزاں اور سہل الحصول نہ ہوتی، اور اس شغل سے قدرت کا مقصد کیا ہے؟ "خوب تر مخلوق" کی تخلیق یہ فلسفہ خود اقبالؔ کی زبان حقیقت ترجمان سے سُنیئے :-

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اُس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات
ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں
آہ! غافل موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے
نقش کی ناپائیداری سے عیاں کچھ اور ہے
جنت نظارہ ہے نقش ہوائے بالائے آب
موجِ مضطر توڑ کر کرتی ہے تعمیرِ حباب
موج کے دامن میں پھر اُس کو چھپا دیتی ہے یہ
کتنی بے دردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ

پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا
توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا
اس روش کا کیا اثر ہے ہیئت تعمیر پر
یہ تو حجت ہے ہوا کی قوت تعمیر پر
فطرت ہستی شہید آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
خوگر پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدن پر کچھ نہیں

پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
داغ شب کا دامن آفاق سے دھوتی ہے صبح
لالۂ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ
بے زباں طائر کو سرمست نوا کرتی ہے یہ
خفتگان لالہ زار و کوہسار و رودبار
ہوتے ہیں آخر عروس زندگی سے ہمکنار

یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

مذہب

اپنی مِلّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
اُن کی جمعیّت کا ہے مُلک و نسب پر انحصار
قوّتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیّت تیری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیّت کہاں
اور جمعیّت ہوئی رخصت تو مِلّت بھی گئی

زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم رواں ہے زندگی
اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے ضمیرِ کُن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دِل سے پُوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

طلوعِ اسلام

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نوا پیرا ہو اے بُلبُل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا کر

ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے

مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونیوالا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی
اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بُلبُل
نوارا تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کمیابی
تڑپ صحنِ چمن میں، آشیاں میں شاخساروں میں
جُدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیرِ سیمابی

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرے ذرے کو شہیدِ جستجو کر دے

درس، پیام، خطاب

اقبال کی شاعری کا ایک خاص جزو یہ بھی ہے کہ اس میں سبق بھی ملتا ہے اور پیام بھی، وہ دعوتِ نظر بھی دیتے ہیں اور دعوتِ التہاب بھی، وہ پیام درد بھی دیتے ہیں، اور لذتِ حرماں بھی،

یہ درس ان کے ہاں مؤثر اور موہ لینے والے الفاظ میں ملتا ہے کہ

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی!

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

شام جس کی آشنائے نالۂ "یارب" نہیں
جلوہ پیرا جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں
جس کا جامِ دل شکستِ غم سے ہے نا آشنا
جو سدا مستِ شرابِ عیش و عشرت ہی رہا

ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوکِ خار سے
عشق جس کا بے خبر ہے ہجر کے آزار سے
کلفتِ غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے
زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے

وطن کے متعلق کہتے ہیں :-

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزاد وطن صورتِ ماہی

حسن ازل ہو پیدا تاروں کی دلبری میں
جس طرح عکس گل ہو شبنم کی آرسی میں
آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا!
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں
یہ کاروان ہستی ہے تیز گام ایسا
قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں
ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

ہلال عید سے خطاب

اوجِ گردوں سے ذرا دُنیا کی بستی دیکھ لے
اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے

قافلے دیکھ اور اُن کی برق رفتاری بھی دیکھ
رہروِ درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ

دیکھ کر تجکو افق پر ہم لٹاتے تھے گہر
اے تہی ساغر ہماری آج ناداری بھی دیکھ

فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر
اپنی آزادی بھی دیکھ اُن کی گرفتاری بھی دیکھ

دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ
بتکدے میں برہمن کی پختہ زنّاری بھی دیکھ

کافروں کی مُسلم آئینی کا بھی نظارہ کر
اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ

ہاں تملق پیشگی دیکھ آبرو والوں کی تو
اور جو بے آبرو تھے اُن کی خودداری بھی دیکھ

جس کو ہم نے آشنا لطف و تکلم سے کیا
اس حریفِ بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ

مشہور نظم "شمع و شاعر" کا ایک حصہ،

شمع شاعر سے کہتی ہے:۔

میں تو جلتی ہوں کہ ہے مضمر مری فطرت میں سوز

تو فروزاں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا

گریہ ساماں میں کہ میرے دل میں ہے طوفانِ اشک

شبنم افشاں تو کہ بزمِ گل میں ہو چرچا ترا

یُوں تو روشن ہے مگر سوزِ دروں رکھتا نہیں

شعلہ ہے مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ترا

قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں

تنگ ہے صحرا ترا محمل ہے بے لیلا ترا

اب نوا پیرا ہے کیا گلشن ہوا برہم ترا

بے محل تیرا ترنم نغمہ بے موسم ترا

تھا جنہیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے

لے کے اب تو وعدہ دیدارِ عام آیا تو کیا

آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی

پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ

صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دِل سے احساسِ زیاں جاتا رہا
جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی
شہر اُن کے مٹ گئے آبادیاں بن ہوگئیں
سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہوگئیں
شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبحِ عید کی
ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن اُمید کی
مژدہ اے پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز
بعد مدّت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہوش
پھر یہ غوغا ہے کہ لاساقی شرابِ خانہ ساز
دِل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

رہزنِ ہمّت ہوا ذوقِ تن آسانی ترا
بحر تھا صحرا میں تو، گلشن میں مثلِ جو ہوا
اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی
چھوڑ کر گل کو پریشاں کارواں بو ہوا
زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا

آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تو ہوا
فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیروں دریا کچھ نہیں
کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں
ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر
اس چمن میں پیرو بلبل ہو یا تلمیذ گل
یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر
آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
دیکھ آکر کوچۂ چاک گریباں میں کبھی!
قیس تو، لیلا بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

بے خبر تو جوہر آئینۂ ایام ہے
تو زمانہ میں خدا کا آخری پیغام ہے

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے ناداں کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے

کیوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے

سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیام ناز کا
جو نظام دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
اے تغافل پیشہ تجکو یاد وہ پیماں بھی ہے؟

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک
بزم گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائے گی

پھر جبیں کو یاد آ جائے گا پیغام سجود
پھر جبیں خاک حرم سے آشنا ہو جائے گی

نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں !
تو کانٹوں میں اُلجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

اگر منظور ہو تجھ کو خزاں ناآشنا رہنا
جہانِ رنگ و بو سے پہلے قطعِ آرزو کر لے

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ ہمیشہ نانِ شعیر پر ہے مدار ، قوّتِ حیدری

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی!

گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زور حیدر، فقر بوذر، صدق سلمانی

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

ٹھوکر

اقبالؔ اپنے اشعار سے نیند کے ماتوں کو ٹھوکر بھی لگاتا ہے کہ وہ بیدار ہوں، ہوشیار ہوں، اٹھیں اور اپنے احساس و عمل کی دنیا آباد کر ڈالیں۔ کہتا ہے:-

بنائیں کیا سمجھ کر شاخ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ! کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈھ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنّا بھی چھوڑ دے
واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں
اقبالؔ کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

یہ رسمِ بزمِ فنا ہے اے دل گناہ ہے جنبشِ نظر بھی
رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہوگا

تیرے آبا کی اگر بجلی تھی جس کے واسطے
ہے وہی باطل ترے کاشانۂ دل میں مکیں

نہیں یہ شانِ خودداری چمن سے توڑ کر تجھکو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیبِ گلو کرلے

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰ
خاک و خوں میں مِل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے
سوئے گردوں نالۂ شبگیر کا بھیجے سفیر
رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
"خواجگی" نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اَب بزمِ جہاں کا اَور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ہمتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک؟
نغمۂ بیداری جمہور ہے سامانِ عیش
قِصّہ خواب آور اسکندر و جم کب تلک؟
آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈُوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک؟
باغباں چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخم گل کے واسطے تدبیر مرہم کب تلک ؟
کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر
نبوّت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگذشتِ ملّتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

ہوئے مدفون دریا زیرِ دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو، بن کر گہر نکلے
غبارِ رہگذر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جنکو!
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو، اکسیر گر نکلے
ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے

حرم رُسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے
زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پایندہ تر، تابندہ تر نکلے
جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے، اِدھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے
یہی قوّت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملّت ہے

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوّت کا بیاں ہو جا، محبّت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اُچھل کر بے کراں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبّت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

لاہور میں ایک مرتبہ، رات بھر کے اندر اندر سرکاری زمین پر بے اجازت مسلمانوں نے مسجد تعمیر کر کے کھڑی کر دی، وہ مسجد بعد میں ڈھا دی گئی۔ اس واقعہ پر اقبال نے کہا:-

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا
تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں پر کیا لذت اس رونے میں
جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا
اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

فکرِ مسلسل

اقبال کے کلام میں ایسی مسلسل اور مربوط نظمیں بھی ملتی ہیں، جو اپنی جدتِ تشبیہ حسنِ بیان، خوبیٔ ادا، ندرتِ خیال، بلندیٔ فکر اور وضعِ اسلوب کے اعتبار سے نہ صرف اردو زبان میں بلکہ دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان میں مایۂ ناز کہی جا سکتی ہیں۔ ایسی نظموں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے مختلف عنوانات کے ماتحت ان کے صنائع و بدائع

پر گفتگو کرنا، اُن کے لطف اور کیف کو کم کر دے گا۔ اس لئے ہم، ایسی چند نظموں کو مختصراً پیش کرتے ہیں

"ایک آرزو" کے عنوان سے اقبالؔ نے ایک معرکہ آرا نظم کہی ہے، اس کی زبان انداز بیان تشبیہات و استعارات، فکر و خیال کا اسلوب ہر چیز دامن دِل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

کرشمہ دامن دِل می کشد کہ جا اینجاست!

نظم ملاحظہ ہو:—

دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یا رب
کیا لُطف انجمن کا جب دِل ہی بُجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دِل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں، عزلت میں دن گذاروں
دُنیا کے غم کا دِل سے کانٹا نکل گیا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہے میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھکو جہاں نما ہو
ہو ہاتھ کا سرہانہ، سبزہ کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو
مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اسکے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر سے لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دُلہن کو
سُرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو
راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جسدم
اُمید اُن کی میرا ٹوٹا ہوا دِیا ہو

بجلی چمک کے اُن کو کُٹیا مری دکھاتے
جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو

پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی موذن
میں اس کا ہمنوا ہوں وہ میری ہمنوا ہو

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں،
روزن ہی جھونپڑی کا مجھکو سحر نما ہو

پھولوں کو آئے جبدم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو نالہ مری دعا ہو

اسی خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر دردمند دِل کو رونا مرا رُلا دے
بیہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

"ماہ نو" کے عنوان سے ایک نظم میں اقبالؔ نے، وہ ادبی موتی بکھیرے ہیں، وہ نئی نئی باتیں کہی ہیں، وہ نادر اور بے مثل تشبیہیں اور استعارے استعمال کئے ہیں کہ بے ساختہ صدائے واہ وا دِل کی انجمن سے بلند ہوتی ہے۔

"ماہ نو" کو دیکھ کر اقبالؔ کہتے ہیں:-

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آب نیل

طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب

نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب

چرخ نے بالی چُرا لی ہے عروسِ شام کی ؛

نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی ؟

"فصدِ آفتاب" "کشتیِ خورشید" "طشتِ گردوں" "شفق کا خونِ ناب" "عروسِ شام کی بالی" ۔ "سیمِ خام کی مچھلی" یہ وہ چیزیں ہیں، جن کی مثال اُردو ادب میں ڈھونڈے سے نہیں مل سکتی۔

"ماہِ نو" کی روشنی آپ دیکھ چکے، اب ذرا جگنو کی چمک دیکھیے، اور دیکھیے کہ

اِک رنگ کا مضموں ہو تو سو طرح سے باندھوں

کو اقبالؔ کِس طرح ثابت کرکے دکھاتا ہے :-

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں

یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں ؟

آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ

یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کِرن میں ؟

یا شب کی سلطنت میں، دِن کا سفیر آیا

غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں

تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا

ذرّہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن کا ؟

حسنِ قدیم کی پوشیدہ اِک جھلک تھی

لے آئی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی

نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

پروانہ اِک پتنگا جگنو بھی اِک پتنگا

وہ روشنی کا طالب یہ روشنی سراپا

"محبت" کے عنوان سے اقبال نے ایک نظم کہی ہے۔ یہ نظم نہیں اسرار و معارف کا مرقع ہے۔ نظم کا ایک حصّہ ملاحظہ ہو:-

سُنا ہے عالمِ بالا میں کوئی کیمیا گر تھا

صفا تھی جس کی خاکِ پا میں بڑھ کر ساغرِ جم سے

لکھا تھا عرش کے پائے پہ اِک اکسیر کا نسخہ

چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشمِ روحِ آدم سے

نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیا گر کی

وہ اس نسخہ کو بڑھ کر جانتا تھا اسمِ اعظم سے

بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب

تمنائے دلی آخر بر آئی سعیِ پیہم سے

پھرایا فکرِ اجزا نے اسے میدانِ امکاں میں

چھپے گی کیا کوئی شے بارگاہِ حق کے محرم سے

چمک تارے سے مانگی چاند سے داغِ جگر مانگا

اُڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے

تڑپ بجلی سے پائی، حُور سے پاکیزگی پائی

حرارت لی نفس ہائے مسیحِ ابن مریم سے

ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی

ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیرِ شبنم سے

پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی سے

مرکب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے

ایک زمانہ تھا کہ عرب صقلیہ (سسلی) کے فرماں روا تھے، وہاں کی مسجدوں سے نعرۂ تکبیر بلند ہوتا تھا۔ وہاں کی خانقاہوں سے قال اللہ کے ترانے گونجتے تھے۔ وہاں کے مکاتب اور مدارس سے قال الرسول کے ارشادات سُنائی دیتے تھے، مسلمان جہاں گئے، اُنہوں نے اپنی انفرادیت باقی رکھی۔ سسلی میں بھی یہی ہوا۔

پھر عربوں کی حکومت کا تختہ اُلٹ گیا۔ اُن کی تہذیب و تمدن کے آثار فنا ہو گئے۔ اُن کے مدارس، اُن کے مکاتب، اُن کے دارالعلوم، اُن کی مسجدیں، اُن کی خانقاہیں ویران ہو گئیں۔

اقبالؔ یورپ جاتے ہوئے، ادھر سے گذرے، یہ جزیرہ اہلِ جہاز کو دُور سے نظر آنے لگتا ہے، اقبالؔ نے اُسے دیکھا، اور اس کی نگاہوں کے سامنے، ایّام، ایامِ سلف کی تاریخ پھر گئی۔

اپنے تصوّر اور تاثر کو اُس نے نظم کا جامہ پہنایا، الفاظ کی تراش خراش مضمون کی اثر آفرینی، خیال کی رفعت، بیان کا سوز، ہر چیز اپنی جگہ داد طلب ہے چند اشعار سُنیے :-

رولے اب دِل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

آہ اے سسلی سمندر کی ہے تجھ سے آبرو
رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو
زیب تیرے خال سے رُخسارِ دریا کو رہے
تیری شمعوں سے تسلی بحر پیما کو رہے

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں ؟
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیاں
درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں

رنگ تصویر کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصّۂ ایامِ سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے
میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رُلواؤں گا

"رات" شاعر سے کہتی ہے :-

کیوں میری چاندنی میں پھرتا ہے تو پریشاں
خاموش صورتِ گل ، مانندِ بو پریشاں
تاروں کے موتیوں کا شاید ہے جوہری تو
مچھلی ہے کوئی میرے دریائے نور کی تو
یا تو مری جبیں کا تارا گرا ہوا ہے
رفعت کو چھوڑ کر جو بستی میں جا بسا ہے
خاموش ہو گیا ہے تارِ ربابِ ہستی
ہے میرے آئینے میں تصویرِ خوابِ ہستی
دریا کی تہ میں چشمِ گرداب سو گئی ہے
ساحل سے لگ کے موجِ بیتاب سو گئی ہے
بستی زمیں کی کیسی ہنگامہ آفریں ہے
یوں سو گئی ہے ، جیسے آباد ہی نہیں ہے

شاعر کا دِل ہے لیکن نا آشنا سکوں سے
آزاد رہ گیا تو کیونکر مرے فسوں سے ؟

شاعر جواب دیتا ہے :-

ہیں تیرے چاندنی کی کھیتی میں گہر بوتا ہوں
چھپ کے انسانوں سے مانند سحر روتا ہوں
دِن کی شورش میں نکلتے ہوئے شرماتے ہیں
عزلت شب میں مرے اشک ٹپک جاتے ہیں
برق ایمن مرے سینہ پہ پڑی سوتی ہے
دیکھنے والی ہے جو آنکھ کہاں سوتی ہے

اسرار و رموز !

زندگی کے اسرار، اور اس عالم خاکی کے رموز بھی اقبال بیان کرتے ہیں،
پیرایۂ بیان ایسا ہوتا ہے کہ راز راز رہتا ہے، لیکن ایک سوال بن کر، کچھ سلجھ بھی جاتا ہے،
اس میں کچھ تڑپ اور زندگی بھی پیدا ہو جاتی ہے، اس کا رنگ کچھ اور نکھر جاتا ہے:-

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ اِنساں !
کہاں جاتا ہے آجاتا ہے کہاں سے
وہیں سے رات کو ظلمت ملی ہے
چمک تارے نے پائی ہے جہاں سے

گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر!
شمع بولی گریۂ غم کے سوا کچھ بھی نہیں

جو موج دریا لگی یہ کہنے سفر سے قائم ہے شان میری
گہر یہ بولا صدف نشینی ہے مجھکو سامان آبرو کا
نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سرو کنار جو
کوئی دِل ایسا نظر نہ آیا نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنّا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے نگار خانہ ہے آرزو کا

موٹر

ہنگامہ آفریں نہیں اس کا خرام ناز
مانند برق تیز مثال ہوا خموش
میں نے کہا نہیں ہے یہ موٹر پہ منحصر
ہے جادۂ حیات میں ہر تیز پا خموش
ہے پا شکستہ شیوۂ فریاد سے جرس
نکہت کا کارواں ہے مثالِ صبا خموش

مینا مدام شورش قلقل سے پا بگل
لیکن مزاج جامِ خرام آشنا خموش

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

فلسفہ ہست و بود

اقبال نے اپنی شاعری میں فلسفہ ہست و بود پر بھی روشنی ڈالی ہے، اور حق یہ ہے کہ اس میدان میں اس کا رخش فلک سیر جتنا تیز جاتا ہے کوئی بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا، اور کمال یہ ہے کہ یہ فلسفہ بیان کرتے ہوئے بھی وہ رنگین نوائی، اور خوش بیانی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔

"جگنو" کی جی بھر کے تعریف کرنے کے بعد، وہ فلسفہ بیان کرتا ہے سنیئے اور گل و بلبل کی زبان سے سنیئے:۔

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی
پروانہ کو تپش دی جگنو کو روشنی دی
رنگیں نوا بنایا مرغان بے زباں کو
گل کو زبان دے کر تعلیم خامشی دی
رنگین کیا سحر کو بانکی دلہن کی صورت
پہنا کے لال جوڑا شبنم کو آرسی دی

سایہ دیا شجر کو، پرواز دی ہوا کو
پانی کو دی روانی موجوں کو بے کلی دی
یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری
جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری
حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے
انداز گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ
نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

"میں اور تو" کے عنوان سے ایک نظم!

مذاق دید سے نا آشنا نظر ہے مری
تری نگاہ ہے فطرت کی راز داں پھر کیا؟
رہین شکوۂ ایام ہے زباں میری
تری مراد پہ ہے دور آسماں پھر کیا؟

فزوں ہے سود سے سرمایۂ حیات ترا
نہ کے لفیب میں ہے کاوش زیاں پھر کیا؟
رکھا مجھے چمن آوارہ مثل موج نسیم
عطا فلک نے کیا تجکو آشیاں پھر کیا؟
ہوا میں تیرتے پھرتے ہیں تیرے طیارے
مرا جہاز ہے محروم بادباں پھر کیا؟

تو ہی شدیہ پہ شد؟ ناتواں شدیم چہ شد؟
چنیں شدیم چہ شد یا چناں شدیم چہ شد؟
بہ ہیچ گونہ دریں گلستاں قرارے نیست
تو گر بہار شدی، ما خزاں شدیم چہ شد؟

تیور

اقبال کے کلام میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو اپنے تیور کے اعتبار سے ایک خاص مقام رکھتے ہیں، جن کے الفاظ گرجتے ہیں، اکڑتے ہیں، مثلاً
میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہو گا

مشہور نظم "شکوہ" کے چند بند :-

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی تورانی بھی !
اہلِ چیں، چین میں ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی
اسی دُنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی
پر ترے نام پہ تلوار اُٹھائی کس نے
بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہمیں چھاؤں میں تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کیلئے
اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لئے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لئے
سربکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کیلئے؟
قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی
بُت فروشی کے عوض بُت شکنی کیوں کرتی؟

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے

پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے

تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے

تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے

نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے

زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

تو ہی کہدے کہ اُکھاڑا درِ خیبر کس نے ؟

شہر قیصر کا جو تھا اُس کو کیا سر کس نے ؟

توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے ؟

کاٹ کر رکھ دیئے کفار کے لشکر کس نے ؟

کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدہ ایراں کو ؟

کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو ؟

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز

قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندۂ صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

محفل کون و مکاں میں سحر و شام کر دے

مئے توحید کو لے کر صفت جام پھرے

کوہ میں دشت میں لے کر ترا پیغام پھرے

اور معلوم ہے تجھکو کبھی ناکام پھرے

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے

بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

"جوابِ شکوہ" کے چند بند!

خدا سے شاعر نے شکوہ کیا تھا، اب عرش الٰہی سے اس کا جواب ملتا ہے:-

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب

زحمت روزہ جو کرتے ہیں گوارا تو غریب

نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب

پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا تو غریب

امرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے

زندہ ہے ملتِ بیضا غربا کے دم سے

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی

برق طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی

رہ گئی رسمِ اذاں رُوحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

شور ہے ہو گئے دُنیا سے مسلماں نابُود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجُود

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یُوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

تم ہو آپس میں غضبناک وہ آپس میں رحیم
تم خطاکار و خطابیں وہ خطاپوش و کریم

چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم
پہلے ایسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم

تختِ مغفور بھی ان کا تھا سریرِ کَے بھی
یُوں ہی باتیں ہیں کہ تم میں وہ حمیت ہے بھی

خودکشی شیوہ تمہارا وہ غیور خوددار
تم اخوت سے گریزاں وہ اخوت پہ نثار

تم ہو گفتار سراپا وہ سراپا کردار
تم ترستے ہو کلی کو وہ گلستاں بہ کنار

اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت اُن کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت اُن کی

تو نہ مِٹ جائے گا ایران کے مِٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں مے خانہ سے

ہے عیاں شورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے

کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصرِ نو رات ہے، دھندلا سا ستارہ تو ہے

سوال و استفسار؟

جوش کلام میں جب شاعر، کوئی سوال کرتا ہے یا کسی سے استفسار کرتا ہے تو اُس کے کلام میں ایک خاص بانکپن، ایک خاص تسلسل پیدا ہو جاتا ہے "خفتگانِ خاک" سے وہ استفسار کرتا ہے :-

اے مئے غفلت کے سرمستو کہاں رہتے ہو تم؟
کچھ کہو اس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم،

وہ بھی جمعیت خانۂ امروز و فردا ہے کوئی
اور پیکار عناصر کا تماشا ہے کوئی؟
آدمی واں بھی حصار غم میں ہے محصور کیا؟
اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا؟
واں بھی جل مرتا ہے سوز شمع پر پروانہ کیا؟
اس چمن میں بھی گل و بلبل کا ہے افسانہ کیا؟
یاں تو اک مصرع میں پہلو سے نکل جاتا ہے دل
شعر کی گرمی سے کیا واں بھی پگھل جاتا ہے دل؟
کیا وہاں بجلی بھی ہے، دہقاں بھی ہے، خرمن بھی ہے؟
قافلے والے بھی ہیں، اندیشۂ رہزن بھی ہے؟
تنکے چنتے ہیں وہاں بھی آشیاں کے واسطے؟
خشت و گل کی فکر ہوتی ہے مکاں کے واسطے؟
واں بھی انساں اپنی اصلیت سے بیگانے ہیں کیا؟
امتیاز ملت و آئیں کے دیوانے ہیں کیا؟

واں بھی کیا فریاد بلبل پر چمن روتا نہیں؟
اس جہاں کی طرح واں بھی درد دل ہوتا نہیں؟

حُسن اَور محبّت

حُسن، محبت، عشق، یہ خاص اصطلاحیں ہیں، اَور انہیں بالکل دُوسرے معنوں میں اقبالؔ نے استعمال کیا ہے، لیکن ان اصطلاحوں سے قطع نظر کرکے عام، اَور متداول معنوں میں انہیں محدود کر کے دیکھئے، تو بھی اقبالؔ نے انہیں جس طرح استعمال کیا ہے، وہ انہی کا حصّہ ہے:-

بیاباں محبت دشتِ غربت بھی وطن بھی ہے
یہ ویرانہ قفس بھی آشیانہ بھی چمن بھی ہے
محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے صحرا بھی
جرس بھی کارواں بھی، رہبر بھی، راہزن بھی ہے
مرض کہتے ہیں سب اس کو یہ ہے لیکن مرض ایسا
چھپا جس میں علاج گردش چرخِ کہن بھی ہے
وہی اک حسن ہے لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں
یہ شیریں بھی ہے گویا، بے ستوں، کوہکن بھی ہے

ایک مسلسل نظم کا ایک ٹکڑا:-

شیشۂ دہر میں مانندِ مئے ناب ہے عشق
رُوحِ خورشید ہے، خونِ رگِ مہتاب ہے عشق
دل ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے کسک اس کی
نور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اس کی

کہیں سامانِ مسرت کہیں سازِ غم ہے
کہیں گوہر ہے کہیں اشک، کہیں شبنم ہے

لذّتِ درد!

دُنیا میں کون ہے جو درد آشنا نہ ہو؟ جسے ناکامیوں اور نامرادیوں سے سابقہ نہ پڑا ہو؟ جس نے زمانہ کی ٹھوکریں نہ کھائی ہوں؟ جس نے تباہی و بربادی کے بحرِ طوفان خیز میں ہچکولے نہ کھاتے ہوں؟ جو ہجر و فراق کی مصیبت سے آشنا نہ ہوا ہو؟

پھر کچھ وہ لوگ ہیں جو اُن آفتوں اور مصیبتوں کو رو رو کر سہتے ہیں، اور کچھ وہ لوگ ہیں جو اُن کا استقبال ہنس ہنس کر کرتے ہیں۔

اقبالؔ، غالبؔ کے اس فلسفہ پہ عامل تھے۔

رفوئے زخم سے مطلب ہے، لذتِ زخمِ سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے؟

وہ درد سے لُطف لیتے تھے، مصیبتوں میں اُنہیں لذّت ملتی تھی۔

فرماتے ہیں:-

نہ پُوچھو مجھ سے لذّت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سینکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

سوز و الم

درد و سوز بھی اقبال کی شاعری کا ایک اہم حصّہ ہے، وہ درد کی کہانی، اور سوز کا فسانہ سُناتے ہیں، روتے ہیں، اور رُلاتے ہیں، خود افسردہ ہوتے ہیں اور انجمن پر افسردگی طاری کر دیتے ہیں۔ لیکن اس درد و سوز کے بیان میں بھی الفاظ کی تراش خراش ترکیب کی چُستی اور بندش کی جدت ایسی ہوتی ہے کہ پڑھنے والا معنی کے ساتھ لفظ پر غور کرنے اور سر دُھننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کہتے ہیں :—

اُڑائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہے داستاں میری
اُڑا لی طوطیوں نے، قمریوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری
الٰہی پھر مزا کیا ہے یہاں دُنیا میں رہنے کا
حیاتِ جاوداں میری نہ مرگِ ناگہاں میری

"والدۂ مرحومہ کی یاد میں" —— اس عنوان سے اقبال نے ایک طویل مرثیہ کہا ہے جو زبان و بیان کا ایک جیتا جاگتا مرقع، اور سوز و الم کی تصویر گویا ہے، چند بند اثر انگیزی کے لحاظ سے خاص طور پر ممتاز ہیں درج کئے جاتے ہیں:۔

آہ یہ دُنیا یہ ماتم خانۂ برنا و پیر
آدمی ہے کس طلسم دوش و فردا میں اسیر
کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت
زلزلے ہیں بجلیاں ہیں، قحط ہیں آلام ہیں
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں
کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں، شہر میں گلشن میں، ویرانے میں موت
نے مجالِ شکوہ ہے نے طاقتِ گفتار ہے
زندگانی کیا ہے اک طوقِ گلو افشار ہے

جدّتِ تشبیہ

تشبیہ اور استعارے سے تمام شعرا کام لیتے ہیں،
مطلب ہے، ناز و غمزہ دلے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
اقبال کی شاعری میں تشبیہہ و استعارہ کی ایک دُنیا آباد ملتی ہے، لیکن اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل نئی، بالکل عجیب، طرفہ تر،
"ہمالہ" پر اقبال نے ایک نظم کہی ہے، اور اس میں اپنی فکرِ فلک رسا کا عجیب

دلنشیں نمونہ پیش کیا ہے،

اس کی برف سے ڈھکی ہوئی بلند و بالا چوٹیوں کو دیکھ کر وہ کہتا ہے۔

برف نے باندھی ہے "دستارِ فضیلت" تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالمتاب پر

برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کو "دستارِ فضیلت" سے تشبیہہ دینا کتنی اچھوتی بات ہے؟ فضائے آسمانی پر لکہ ہائے ابر کو اُڑتے ہوئے ہم آپ سب دیکھتے ہیں، "بے زبان" بھی، اور "زباندان" بھی، لیکن یہ منظر دیکھ کر اقبال کو کتنی نئی بات سوجھتی ہے:۔

ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
"فیلِ بے زنجیر" کی صورت اُڑا جاتا ہے ابر

"فیلِ بے زنجیر" کی تشبیہہ پر آپ نے غور کیا؟

"ابرِ کوہسار" کا ترانہ اقبال کی زبان سے سُنیئے:۔

دُور سے دیدۂ اُمید کو ترساتا ہوں
کسی بستی سے جو خاموش گذر جاتا ہوں
سیر کرتا ہوا جس دم لبِ جُو آتا ہوں
بالیاں نہر کو گرداب کی پہناتا ہوں
سبزۂ مزرعِ نوخیز کی اُمید ہوں میں
زادۂ بحر ہوں، پروردۂ خورشید ہوں میں

"گرداب" کو بالی سے تشبیہہ دینا کتنی نادر تشبیہہ ہے۔

مانند خامہ تیری زباں پر ہے حرفِ غیر

بیگانہ شے پہ نازشِ بیجا بھی چھوڑ دے

ایک طویل نظم کے چند شعر:-

آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی

آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی

آئینہ روشن ہے اس کا صورتِ رُخسارِ حُور

گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چُور

لہر جو نکلی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے

یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے

جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی

مضطرب بُوندوں کی اک دُنیا نمایاں ہو گئی

ہجران قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے

دو قدم پر پھر وہی جو مثلِ تارِ سیم ہے

طنز و تعریض

شاعرانہ طنز کی دلچسپ اور پُر لطف مثالیں بھی اقبال کے ہاں خوب ملتی ہیں، واعظ اور ناصح، زاہد اور محتسب، شاعروں کے مخصوص موضوع ہیں، اقبال کے میخانہ میں بھی اُن

کی پگڑی اچھلتی ہے، فرماتے ہیں۔

عجب واعظ کی دینداری ہے یارب
عداوت ہے اُسے سارے جہاں سے
بڑی رنگیں ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آواز اذاں سے

جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ چن کے تو
آہی نکلے گی کوئی بجلی جلانے کے لئے

موت کا نسخہ ابھی باقی ہے اے دردِ فراق
چارہ گر دیوانہ ہے میں لا دوا کیونکر ہوا؟

اُمید تو رنے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادھے بھولے بھالے ہیں

اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اسے واعظ
خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

واعظ کمالِ ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دُنیا جو چھوڑ دی تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

حُسنِ تکلّم

اقبال کی شاعری کا ایک اہم جزو "حسن بیان" بھی ہے، وہ جانی بُوجھی حقیقتوں کو، روزمرہ کے واقعات کو، دیکھے ہوئے نظاروں کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اُس کا حسنِ بیان ایک نیا سماں اور نئی کیفیت پیدا کر دیتا ہے،

"ابرِ کوہسار" کے عنوان سے اُس نے ایک دِلنشیں نظم کہی ہے، کہتا ہے :-

کبھی صحرا، کبھی گلزار ہے مسکن میرا
شہر و ویرانہ مرا بحر مرا، بن میرا
کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھکو
سبزہ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھکو

نظارے کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

جوانی ہے تو ذوق دید بھی لطفِ تمنا بھی
ہمارے گھر کی آبادی قیامِ میہماں تک ہے

کس قدر اے مے تجھے رسمِ حجاب آئی پسند
پردۂ انگور سے نکلی تو میناؤں میں تھی

اقبالؔ کی نظارہ کشی کا ایک منظر ملاحظہ ہو:-

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر
گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب
شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار
موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر
انجم کم ضو گرفتارِ طلسمِ آفتاب

اور ذرا آگے چل کر کہتے ہیں:-

اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ خضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل
وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیل
وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل
اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل
پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

زبان و بیان

اقبال کے کلام میں زبان و بیان کا لطف بھی بدرجہ اتم موجود ہے، الفاظ یہ معلوم ہوتا ہے، انگشتری میں نگینہ جڑا ہوا ہے، ذرا اِدھر سے اُدھر کر دیجئے، تو اس کی خوبی و رعنائی پر پانی پڑ جاتے۔

گھٹا اٹھی، اور

چمن میں حکمِ نشاطِ مدام لائی ہے
قبائے گل میں گہر ٹانکنے کو لائی ہے

جو پھول مہر کی گرمی سے سو چلے تھے اُٹھے
زمیں کی گود میں جو پڑ کے سو رہے تھے اُٹھے
ہوا کے زور سے اُبھرا، بڑھا، اُڑا بادل
اُٹھی وہ اَور گھٹا، لو، برس پڑا بادل

"چاند" کے عنوان سے ایک نظم کے چند شعر:۔

یہ داغ سا جو تیرے سینے میں ہے نمایاں
عاشق ہے تو کس کا یا داغ آرزو ہے؟
تو ڈھونڈتا ہے جس کو تاروں کی خامشی میں
پوشیدہ ہے وہ شاید غوغائے زندگی میں
استادہ سرو میں ہے، سبزہ میں سو رہا ہے
بلبل میں نغمہ زن ہے، خاموش ہے کلی میں
آ میں تجھے دکھاؤں رخسار روشن اس کا
نہروں کے آئینہ میں شبنم کی آرسی میں
صحرا و دشت و در میں کہسار میں وہی ہے
انساں کے دل میں تیرے رخسار میں وہی ہے

"بزم انجم" کے چند شعر:۔

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو
طشتِ افق سے لیکر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور
قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اُتارے
محمل کی خامشی کی لیلائے ظلمت آئی
چمکے عروسِ شب کے موتی وہ پیارے پیارے
وہ دور رہنے والے ہنگامۂ جہاں سے
کہتا ہے جسکو انساں اپنی زباں میں تارے

گلۂ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بُت کدہ میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دِل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ
تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج
موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ
عامِ حرّیت کا دیکھا تھا جو خواب اسلام نے
اے مُسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

تغزّل

تغزّل کا رنگ بھی اقبالؔ کے ہاں ملتا ہے، اور یہ رنگ بھی پھیکا نہیں چوکھا ہے۔ اقبالؔ داغؔ کے شاگرد تھے، اُن کے تغزّل میں بھی داغؔ کا رنگ کہیں کہیں جھلکتا ہے اور اُن کی انفرادیت بھی پوری شان سے موجود ہے، شعر سنیئے :۔

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں
تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ

قابل تو تھا اُن کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی ؟

میرے مٹنے کا تماشا دیکھنے کی چیز تھی
کیا بتاؤں میرا ان کا سامنا کیونکر ہوا ؟

میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن
دیکھے مجھے کہ تجھکو تماشا کرے کوئی ؟

چھپتی نہیں ہے یہ نگہ شوق ہم نشیں
پھر اور کس طرح انہیں دیکھا کرے کوئی

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں
کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل
چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہدی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

تجھے کیوں فکر ہے اے گل دلِ صد چاک بُلبُل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے

خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہ دام ابھی

پھر بادِ بہار آئی اقبالؔ غزلخواں ہو
غنچہ ہے اگر گُل ہو، گُل ہے تو گلستاں ہو

ہردلعزیز کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت	کتاب	مصنف	قیمت
میمونہ	رئیس احمد جعفری	۸-۰	پاکستان میں ذہنی رجحانات		۵-۰
باغی	,,	۴-۵۰	عذر گناہ	بدر شکیب	۵-۰
چیلنج	قیسی رامپوری	۷-۵۰	امنگ	فخرالحسن	۳-۷۵
پھیکی جنت	,,	۷-۵۰	تاحد نگاہ	ضیا سرحدی	۳-۵۰
روحی	,,	۴-۰	دکان شهشه‌گر	عبدالعزیز خالد	۳-۰
کالی گھٹائیں	احمدشجاع پاشاہ	۶-۰	غزل الغزلات	,,	۱-۷۵
فلورا	,,	۲-۵۰	سریلی بانسری	آرزو لکھنوی	۲-۰
نسیم	رشیداخترندوی	۴-۰	فغان آرزو	,,	۴-۵۰
نشان راہ	,,	۳-۵۰	عرش و فرش	جوش ملیح آبادی	۴-۰
تلخیاں	,,	۳-۵۰	نقش و نگار	,,	۳-۵۰
تشنگی	,,	۴-۵۰	آیات و نغمات	,,	۳-۵۰
بادو باراں	,,	۳-۰	حرف و حکایت	,,	۳-۰
نشمین	,,	۴-۰	شاعر کی راتیں	,,	۱-۲۵
ایک پہیلی	,,	۵-۰	حسین و انقلاب	,,	۱-۰
پہلی کرن	,,	۵-۰	شعلہ و شبنم	,,	۵-۰
نسرین	,,	۴-۰	فکر و نشاط	,,	۲-۵۰
حادثے	ظفر عالمگیر	۳-۰	جنون و حکمت	,,	۳-۰
فسانہ	عشرت رحمانی	۳-۰	سنبل و سلاسل	,,	[illegible]
درد نہ جانے کوئی	,,	۴-۵۰	سیف وسبو	,,	
ناہید	عبیداللہ قدسی	۵-۰	روح ادب		

بک لینڈ

۱۲ محمد بلڈنگ بندر روڈ کراچی

فون ۳۶۱۰۹